راہِ علم و عمل

طلبہ کی تخلیقی، تحقیقی، علمی اور تحریری
صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کیلئے
کوشاں، ششماہی شمارہ

شعبان المعظم 1437ھ بمطابق مئی 2016

اس شمارے میں

- ادا ریہ
- تندی باد مخالف سے
- پاسپورٹ آفس کی سیر
- تقابل ادیان کے بنیادی اصول
- علامہ سعیدی بحیثیت مجتہد
- سلام کی اہمیت و فضیلت
- رواداری کا مفہوم
- دین ابراہیمی
- انسان کا ارتقاء
- انسان اور نفسیات
- امت مسلمہ کا عروج و زوال
- Issues of Pakistan's Economy and their Solutions

راہِ علم و عمل

طلبہ کی تخلیقی، تحقیقی، علمی اور تحریری
صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کیلیۓ
کوشاں، ششماہی شمارہ

فی شمارہ:۔35روپے

شعبان المعظم 1437ھ بمطابق مئی 2016

اس شمارے میں

❖ اداریہ		2
❖ تندئ بادِ مخالف سے	محمد یحییٰ	3
❖ پاسپورٹ آفس کی سیر	محمد صدیق	7
❖ تقابل ادیان کے بنیادی اصول	مقصود حسین	11
❖ علامہ سعیدی بحیثیت مجتہد	حبیب الرحمٰن	17
❖ سلام کی اہمیت وفضیلت	محمد نذیر	21
❖ رواداری کا مفہوم	محمد فیاض	24
❖ دین ابراہیمی	ناد علی	27
❖ انسان کا ارتقاء	فدا احمد	30
❖ انسان اور نفسیات	ظہور احمد	32
❖ امت مسلمہ کا عروج وزوال	امیر بخش	34
❖ Issues of Pakistan's Economy and their Solutions	S.M.Zubair Sherazi	37

چیف ایڈیٹر:۔ محمد صدیق

ایڈیٹر:۔ مقصود حسین

سب ایڈیٹرز:۔ محمد فضل، محمد نذیر

لیگل ایڈوائزر:۔ ایڈوکیٹ محمد نواز

آرگنائزر:۔ ضمیر حسین

کو آرگنائزر:۔ شان عباس

فنانس مینیجر:۔ عبد الغفار

مارکیٹنگ مینیجر:۔ غلام یاسین

مزید معلومات اور فیڈبیک کیلیۓ

www.facebook.com/Rah e ilm o amal

اداریہ

تمام تعریفیں اللہ رب العزت کے لئے، جس نے انسانوں کو مختلف صلاحیتوں اور قابلیتوں سے بہرور فرمایااور بے شمار درود وسلام حضور ﷺ کی ذات اقدس پر جنہوں نے انسان کی صلاحیتوں کو عملی طور پر زندہ کیااور ان کی آبیاری فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ لاتعداد صلاحیتوں میں سے ایک تحریری صلاحیت بھی ہے جو کہ ہر انسان میں فطرۃً پائی جاتی ہے مگر ابتداءً ہر کسی کو اس کا ادراک تک نہیں ہوتا اور نہ ہی کبھی توجہ مبذول ہوئی ہوتی ہے، جس کی بنا پر اکثر لوگ اس قابلیت سے استفادہ نہیں کر پاتے بلکہ اکثر تو لاعلمی کی وجہ سے کوشش تک نہیں کرتے۔لہذا وہ احباب تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس فن سے اپنے علم کو دوسروں تک پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اگر کوئی لکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو اس خوف سے اپنا کام ادھورا چھوڑ دیتا ہے کہ یہ چھپ نہیں پائے گا، کیونکہ اکثریت کے پاس کوئی پلیٹ فارم نہیں ہوتا، جس کے ذریعے ایک تو انکی تحریری اصلاح ہو سکے دوم باقاعدہ اشاعت ممکن بن سکے۔

اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک چھوٹی سی کاوش "راہ علم و عمل" کے پلیٹ فارم سے کی جارہی ہے تاکہ نہ صرف طلبہ کو اس جانب لایا جاسکے بلکہ انکی ابتدائی تحریروں کو شائع کیا جائے تاکہ آگے چل کر وہ بہت اچھے لکھاری (writer) بن سکیں۔

اس پہلے شمارے میں ایسے ہی چند طلبہ کی تحریریں شامل کی گئی ہیں، جن میں سے اکثر نے پہلی مرتبہ ہی قلم فرسائی کی ہے۔ نیز اس شمارے کی انتظامیہ بھی طلبہ پر مشتمل ہے، جنہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت اس عظیم اور کٹھن کام کا بیڑا اپنے سر لیا ہے اور انتھک محنت کے بعد اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ہم اپنے اُن تمام احباب کے نہایت مشکور ہیں کہ جنہوں نے اس کام کے حوالے سے نہ صرف ہماری رہنمائی فرمائی بلکہ اس کی تکمیل کے لئے مختلف انداز سے معاونت بھی کرتے رہے۔

امید واثق ہے کہ قارئین کو ہماری یہ چھوٹی سی کاوش پسند آئے گی اور اس کوشش کے دوران ہم سے یقیناً کئی خامیاں بھی رہ گئی ہونگی، جس کے حوالے سے آپ کی رہنمائی اور فیڈ بیک ہمارے لئے باعث افتخار ہوگا۔ نیز نئے لکھنے والے طلبہ بھی اپنی تحریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے سامنے آتے رہیں گے۔

والسلام

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب

ابو عبد القدوس محمد یحییٰ

ابتدائے آفرینش سے انسان خواہشات، تمناؤں، آرزوؤں کا مجسمہ ہے۔ وہ سارے جہاں کو اپنے تصرف میں لینا چاہتا ہے، ہر خوبصورت چیز کو اپنا بنانا اور ہر قیمتی چیز کا مالک بننا چاہتا ہے بلکہ مثل پارس چاہتا ہے کہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگائے وہ سونا بن جائے۔ الغرض خواہشات کا ایک نہ رکنے والا سیلاب ہے اور حدیث کی رو سے ،لن یملا فاہ الاالتراب۔"انسان کے منہ کو صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے"(متفق علیہ)۔ یعنی اس کی خواہشات کو صرف موت ہی لگام دے سکتی ہے۔

اس حدیث میں خواہشات کی مکمل نفی نہیں کی گئی بلکہ یہاں نفس کے سرکش گھوڑے کو لگام دینا مقصود ہے۔ خواہشات کا ابھرنا تو فطری امر ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو و آرزو ہی ترقی و کامیابی کے لئے مہمیز و محرک ہے۔ جائز خواہشات کی تکمیل اور کامیابی کی تمنا کرنے میں کوئی عیب نہیں۔ ہر شخص فطری طور پر کامیابی کا متمنی ہے۔ ناکامی تو ناکامی، شکست خوردہ انسان کو بھی کوئی گلے لگانے کے لئے تیار نہیں ہوتا لیکن جب جدوجہد اور عملی کوشش کی بات کی جائے تو کامیابی کے عملی اقدامات بہت کم افراد کرتے ہیں۔ اکثر بلا سعی و عمل ہی کامیابی کے آرزومند ہوتے ہیں۔ اور اپنے قدم تو درکنار اپنی پلکوں تک کو جنبش دیئے بغیر عنقاء پرندے ہما کے منتظر رہتے ہیں اور اس کے باوجود کامیابی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ قرآن مجید میں بیان کردہ اس حقیقت کو فراموش کردیتے ہیں:

وان لیس للانسان الا ما سعی۔ اور بے شک انسان کو وہی کچھ حاصل ہوتا ہے جس کی وہ کوشش کرے (النجم:۳۹)۔ دارالعمل میں کامیابی رنگین خیالات ، تخیل، سہانے خواب دیکھنے سے نہیں بلکہ عمل، جدوجہد اور کوشش سے ملتی ہے۔

ہے عمل لازم تکمیل تمنا کے لئے
ورنہ رنگین خیالات سے کیا ہوتا ہے

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ خواہشات کے اس سیلاب کو عملی دھارے کا رخ دیا جائے۔ جب کسی کام کی ابتدا مقصود ہو تو پہلے اچھی طرح اس کے عملی خاکے ،عواقب و نتائج پر غور و فکر کرلیا جائے اور بہتر ہے کہ استخارہ بھی کرلے۔ استخارہ کے معنی ہی بھلائی طلب کرنا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اہم کام شروع کرنے سے پہلے استخارہ کرتا ہے تو اگر اس کام میں انسان کے لئے بھلائی ہے تو اس کام میں آسانی پیدا ہو جاتی ہیں اور ایسے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں جن کی مدد سے وہ کام پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

فسنیسرہ للیسری (اللیل:۷) اس کو ہم آسان راستے کے لئے سہولت دیں گے۔ یعنی بھلائی اور اچھائی کے راستے پر چلنا اس کے لئے آسان بنادیں گے اور اس کے لئے اچھے کام ہی آسان بنادیئے جائیں گے۔ اگر وہ کام دنیا و آخرت کے خسارہ کا باعث ہے تو اس کام میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اس طرح اس کام کو نہ کرنے کا خیال اس کے دل میں جاگزیں ہو جائے گا۔

جب ایک بار کام کے عواقب ونتائج سے بہرہ مند ہوگئے اور جان لیا کہ وہ ناممکن العمل نہیں یعنی آسمان سے تارے توڑنے کے مترادف نہیں اور انسانی بساط میں ممکن ہے پھر خواہ چاند پر جانے ہی کا کام کیوں نہ ہو اور وہ اپنی قوت، طاقت، استطاعت، صلاحیت، قابلیت، لیاقت، دلچسپیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کام کا ارادہ کر چکا ہے تو پھر کسی بھی طور پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ نہ ہی ناکامی کے خوف سے اپنی جدوجہد ترک کرے بلکہ ناکامی کا شائبہ تک دل میں نہ لائے۔ بہترین منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی اختیار کرنے کے بعد دلچسپی، لگن، دلجمعی، یکسوئی اور خلوص کے ساتھ سخت کوشش و محنت کرے اور نتیجہ اللہ رب العزت پر چھوڑ دے۔ اس عمل سے اس کے اعتماد میں اضافہ اور کام میں حسن و نکھار پیدا ہو گا۔ قابل تعریف ہیں وہ افراد جو خواب دیکھنے کے بجائے عملی اقدامات کرتے ہیں۔ خالی بیٹھنے کے بجائے دوسروں کی خاطر کام کرنا پسند کرتے ہیں جیسے شہد کی مکھی جو ہمہ وقت دوسروں کو شہد کی مٹھاس وچاشنی دینے کے لئے مصروف عمل رہتی ہے اور اللہ رب العزت نے اسے یہ اعزاز بخشا کہ قرآن مجید کی ایک سورت اس کے نام سے موسوم کر دی۔

نتائج:

انسانی کوشش کے نتائج کی تین صورتیں ہیں۔ مکمل کامیابی، جزوی کامیابی اور ناکامی۔ اگر سوچ مثبت ہو تو تینوں صورتیں ہی سود مند ہیں۔

1۔ مکمل کامیابی: کامیابی تو بہر کیف ہے ہی کامیابی کہ انسان نے اپنی منزل مقصود حاصل کر لی۔

2۔ جزوی کامیابی: بعض اوقات انسان کو مکمل کامیابی کے بجائے جزوی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ آدھا گلاس بھرے ہونے کی صورت میں مثبت سوچ رکھنے والا غم کے بجائے خوشی کا اظہار کرے گا۔ جیسا کہ انگریزی محاورہ ہے (Half a loaf is better than none) "بالکل نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے"۔

3۔ مکمل ناکامی: بہترین منصوبہ بندی اور کوشش کے باوجود بھی اگر ناکامی ہوئی تو اس کا افسوس نہیں کرنا چاہئے اور انسان کو اپنی سوچ مثبت رکھنی چاہئے کیونکہ مقابلہ کرنے والا ہی کامیاب اور ناکام ہوتا ہے۔ شہسواری کرنے والا ہی گھوڑے سے گرتا ہے ورنہ گھٹنوں کے بل چلنے والا شیر خوار طفل کہاں گرے گا۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے، جو گھٹنوں کے بل چلے

فلسفہ ناکامی:

خواہ معاملات انفرادی ہوں یا اجتماعی، ناکامی اسباب اور وسائل کی کمی سے نہیں بلکہ ذہنی اضمحلال، قوت فیصلہ کے فقدان اور جذبات کی کمی سے واقع ہوتی ہے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کا صرف اور صرف ایک ہی نتیجہ ہے ناکامی، ذلت ورسوائی۔ تاریخ میں کامیاب اور ناکام دونوں کرداروں کی بے شمار مثالیں ہیں جب کوئی قوم لڑائی اور نقصان کے خوف سے بغیر لڑے جنگ ہار گئی اور عبرتناک انجام سے دوچار ہوئی یا قلیل فوج نے سازوسامان کی پرواہ کئے بغیر بڑی فوج کو ہزیمت اور شکست سے دوچار کیا۔ طارق بن زیاد نے کشتیاں

جلانے، فرار کے راستے مسدود کرنے اور ناکامی کا خوف اپنی فوج کے دل سے نکالنے کے بعد جب اندلس پر بغیر سازوسامان بارہ ہزار کی قلیل فوج کے ساتھ حملہ کیا تو زنگ آلود تلواروں والی قلیل فوج نے دیار غیر میں بہادری کی وہ لازوال داستانیں رقم کیں اوراس بے جگری سے دشمن پر وار کیا کہ ایک لاکھ مسلح دشمن کی فوج ان کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور میدان بدر ہو گئی۔یہ ٹوٹی تلوار والے ایک لاکھ کے مسلح لشکر پر غالب آ گئے۔

کپڑوں پر پیوند لگے ہیں تلواریں بھی ٹوٹی ہیں

پھر بھی دشمن کانپ رہے ہیں آخر لشکر کس کا ہے

زخموں کے نشان بدن پر سجانے والے مجاہدین جنہوں نے میدان جنگ میں دشمنوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا، اگر یہ شکست بھی کھاجاتے تو بھی انہیں موردالزام نہ ٹھہرایا جاتا کیونکہ انہوں نے جس ہمت وجرأت کا مظاہرہ کیا وہ بہرحال قابل قدر وستائش تھا۔اس کے برخلاف پر تعیش محلوں کے وہ باسی جنہوں نے مقابلے کی ہمت ہی نہ کی اور بغیر جنگ لڑے اپنا مال ،جان اور عزت دشمن کے حوالے کر دی۔ جیسا کہ خلیفہ مستعصم جس نے تین لاکھ کی فوج اور جلال الدین خوارزم کی دعوت کے باجود صرف اس خوف سے تاتاریوں کے خلاف جنگ میں حصہ نہ لیا کہ شکست کی صورت میں بغداد کو نقصان پہنچے گا۔ تاریخ شاہد ہے کہ بالآخر ہلاکو خان نے اردگرد کے تمام مسلم علاقوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد بغداد پر نہ صرف حملہ کیا بلکہ اسے مکمل تباہ وبرباد کر دیا اور بیس لاکھ کی آبادی والے شہر سے صرف چار لاکھ افراد ہی زندہ فرار ہو سکے، خلیفہ وقت بھی مارے جانے والے لوگوں میں شامل تھا اور کئی دن تک دجلہ فرات میں پانی کی بجائے لاکھوں مسلمانوں کا خون اور لاکھوں نادر ونایاب کتابوں کی سیاہی بہتی رہی۔اوران کی مثال اس شخص کی طرح تھی جس نے آگ لگ جانے کے بعد اس خوف سے ہاتھ پاؤں تک نہ مارے کہ باوجود کوشش وہ جل کر مر جائے گا۔تو یقینا اس ہلاکت کا سبب اس کی اپنی کوتاہی اور سستی ہے۔

کتنے معصوم ہیں انساں کہ جل جاتے ہیں

اپنی کوتاہی کو دے کر غم وآلام کا نام

ناکامی پر افسوس!

عظیم اور کامیاب ترین افراد کی بھی ہر کوشش کا کامیابی سے ہمکنار ہونا ضروری نہیں ۔بعض اوقات ناکامی کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے ۔**جیسا کہ مشہور سائنسدان اورموجد تھامس ایڈیسن(1847) کا شہرہ آفاق قول ہے کہ بلب کی ایجاد سے پہلے مجھے تقریباً تین سو بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس سے میں نے تین سو ایسے طریقے بھی دریافت کئے جن سے بلب نہیں بنتے** اوراسی وجہ سے وہ صرف ایک بلب کی ایجاد تک محدود نہ رہا بلکہ اس نے اپنی زندگی میں تیرہ سو ایجادات رجسٹرڈ کرائیں اور آنے والوں کے لئے کئی ایسے راستے روشن کر گیا جن کے مرہون منت ہی آج سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی ممکن ہوئی۔

لہذا اگر محنت و جدوجہد اور بہترین حکمت عملی کے باوجود بھی شکست ہو جائے تو پھر ناکامی پر افسوس وندامت نہیں ہونا چاہئے کیونکہ کسی بھی کام کے نتائج کے اظہار کی دوصورتیں ہیں۔

دنیاوی اور اخروی، عارضی اور قطعی، وقتی اور ابدی۔ اس وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو حقیقت یہی ہے کہ:

اِنَّ اللہ لَایُضِیعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِینَ۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے اجر ضائع نہیں کرتا (التوبۃ:۱۲۰)۔ اور حدیث مبارکہ: عجبا لامر المؤمن ان امرہ کلہ لہ خیر ولیس ذالك لاحد الا للمؤمن۔ ان اصابتہ سراء شکر فکان خیرا لہ وان اصابتہ ضراء صبر فکان خیرالہ۔ "مومن کا معاملہ حیرت انگیز ہے۔

اس کے ہر معاملے میں خیر و بھلائی ہے۔ ایسا مومن کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے نہیں ہے۔ اگر اسے کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ رب کا شکر ادا کرتا جس میں اس کے لئے بھلائی ہے اور اگر اس کو کوئی نقصان (ناکامی) پہنچے تو اس پر وہ صبر کرتا ہے جس میں اس کے لئے بھلائی ہے۔" (مسلم)۔ اس طرح مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا بلکہ صحت و مرض، غناء و فقر، کامیابی و ناکامی، خوشی و غم اور نفع و نقصان الغرض زندگی کے تمام احوال میں وہ رب العزت کا شکر ادا کرتا ہے اور اس کی رضا حاصل کرتا ہے جو مومن کی زندگی کا مقصد حقیقی و نصب العین ہے۔

دنیاوی اعتبار سے بھی ناکامی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ انسان اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا ادراک کرلیتا ہے۔ غلطی جان لینے کے بعد اسے دہرانا یہ مومن کی شان کے خلاف ہے۔ لایلدغ المومن من جحر واحد مرتین۔ یعنی مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ وہ نہ صرف اپنی غلطیوں بلکہ دوسروں کی غلطیوں سے بھی سبق سیکھتا ہے اوران کا تدارک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ثانیاً وہ یہ بات جان لیتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ جس کی تلاش میں کچھ دوسری راہیں اس پر روشن ہوجاتی ہیں جو انسان کو کامیابی کی شاہراہ پر گامزن کردیتی ہیں۔ جب وہ ایک نئے عزم کے ساتھ دوبارہ کوشش کرے گا تو کم از کم ان غلطیوں کو نہیں دہرائے گا جن کی وجہ سے اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال انسان کو کبھی بھی مایوس، مضمحل، پژمردہ نہ ہونا چاہئے۔

نہ ہو مضمحل میرے ہم سفر، تجھے شاید نہیں اس کی خبر
ان ہی ظلمتوں کے دوش پر ابھی کاروان سحر بھی ہے

عظیم مقاصد کے حامل افراد اگر اپنے مقصد عظیم میں کامیاب نہ بھی ہوں تو چھوٹے چھوٹے کئی فوائد ضرور حاصل کرلیتے ہیں۔ مثلاً پھل دار درخت لگانے والا اگر اس درخت سے پھل نہ بھی حاصل کرپائے پھر بھی اس کے سایہ سے محروم نہ ہوگا اور ماحولیاتی آلودگی میں ضرور کمی کا باعث بنے گا۔ یا علم کی فضیلت جاننے والا اگر علم کی بڑی بڑی قندیلیں روشن کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے لئے اپنی مکمل زندگی صرف کردے اگر اس میں اسے کامیابی نہ بھی حاصل ہوئی، مکمل معاشرہ علم کے نور سے روشن نہ بھی ہوا، تو اس سے مستفید طبقہ کچھ علم کے نور سے تو مستفیض ہوگا اور اس طرح وہ اپنے بجھنے سے پہلے کچھ شمعیں تو جلانے میں بہرحال کامیاب ہو ہی جائے گا۔

عمر بھر جلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم

پاسپورٹ آفس کی سیر

محمد صدیق(5th year)

انسان اس دنیامیں بہت کچھ سیکھتاہے جس کے لئے تجربات کے میدان سے گزر ہوتا ہے، اس دوران تکالیف اور مشکلات سے بھی پالا پڑتا ہے ، جنہیں برداشت کر کے ہی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ راستہ نہ صرف کٹھن بلکہ صبر آزما بھی ہوتاہے، نیز اس مشکل میں تب اور اضافہ ہو جاتا ہے جب کوئی رہنمائی کرنے اور ساتھ چلنے والا نہ ہو، ایسے میں اکثر منزل تک رسائی آسان نہیں ہوتی۔ یہ تجربات بڑی سطحوں کے علاوہ چھوٹی سے چھوٹی سطح پر بھی حاصل ہوتے ہیں، ایک ایساہی تجربہ پیش خدمت ہے۔

راقم الحروف کو کسی وجہ سے اپنا پاسپورٹ بنوانے کی ضرورت پیش آئی لہذا پہلی مرتبہ پاسپورٹ آفس کی سیر کو نکل پڑا، جب وہاں پہنچاتو ایسا محسوس ہوا کہ میدانِ حشر میں داخل ہو گیا ہوں ، ہر طرف لوگوں کی لائنیں تھیں، کچھ لوگ پبلک کرسیوں پر بیٹھے غور و فکر کی دنیا میں مگن تھے تو کچھ تحریر میں مستغرق تھے تو کچھ باہم گفتگو میں محو تھے، گویا نفسی نفسی کا ماحول تھا، میں بھی جاکر ایک بینچ پر تشریف فرما ہو ا، اورچند منٹ ارد گرد کا مشاہدہ کرنے کے بعد میں نے اپنے کزن سے رابطہ کیا جن کی رہنمائی میں آگے کا سفر طے کرنا تھا، مگر ان کے آنے میں کچھ وقت ابھی باقی تھا، جب تک وہ آتے تب تک کچھ تو کرنا تھااور ہم تو ٹھہرے طالب علم، لہذاایسے انتظار کے لمحات کے لئے اپنی ایک دوست کو ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں تاکہ وہ ہم سے باتیں کرے اور ہمیں بور ہونے نہ دے، وہ کوئی اور نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی ہے، لہذا دنیاومافیھا سے لاتعلق ہو کر ایسی ہی ایک کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا، یہاں تک کہ ایک محترمہ نے Excuse me کہہ کر اس تسلسل کو توڑ ڈالااور ہمارے لاڈلے قلم کا سوال کیا، وہ تو ہم نے دے دیا مگر کیا خبر تھی کے قلم واپس ملنے کا امکان نہیں یا بہت کم ہے، بہر کیف پھر سے کتاب کی طرف متوجہ ہوا۔ کچھ دیر بعد کزن نے فون پر رہنمائی کرتے ہوئے کہا کہ جب تک وہ آئیں تب تک میں وہاں سے Ordinary Form لیکر فل کر دوں، فارم تو لے لیا اب جب فل کرنے لگاتو معلوم ہوا کہ پین تو ایک محترمہ نے لے لیا تھا، جب ان سے مانگاتو کہنے لگیں کہ واپس کر دوں گی اور یہ کہہ کر وہاں سے جانے لگیں ، ہم بھی خاموش ہوگئے اور کرتے بھی کیا، آج کل خواتین کے اتنے حقوق ہو گئے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی بیچارہ مرد چھینک بھی دے تو، توہین نسواں کے زمرے میں آجاتا ہے۔ بہر کیف مسئلہ پین کا نہ تھا بلکہ ضرورت پین کا تھا، اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک نیم باباجی کو فارم فل کرتے ہوئے پایالہذا انکی طرف لپک پڑا تاکہ ان سے قلم لے لیا جائے مگر موصوف اس قدر تحمل سے فارم فل کر رہے تھے گویا وصیت نامہ لکھ رہے ہوں اور فارم فل کرنے

کے بعد بغور پروف ریڈنگ بھی کی، تب جا کر پین ملا۔
کچھ دیر بعد میرے کزن (ماموں زاد بھائی) غلام مصطفیٰ صاحب بھی تشریف لے آئے اور انکے ہمراہ خاندان کی چند خواتین بھی تھیں جن کے پاسپورٹ بنوانے کی ڈیوٹی بھی موصوف کی تھی۔ کیونکہ غلام مصطفیٰ صاحب اس طرح کے دفاتر اور ہسپتالوں کے چکر لگا لگا کر خوب ایکسپرٹ ہو چکے ہیں، گاؤں کے اکثر احباب ایسے کاموں کے لئے انہیں ہی زحمت دیتے ہیں۔ موصوف بھی خدمت خلق کے جذبے کے تحت فری آف کاسٹ اپنی خدمات سرانجام دیتے رہتے ہیں، اللہ انہیں خوش رکھے اور جزائے خیر دے اور مجھے امید ہے کہ وہ یہ سارے کام (میار) سے بچنے کے لئے نہیں کرتے ہونگے بلکہ رضائے الٰہی اِن کے پیش نظر ہو گی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ (میار) کیا بلا ہے؟ دراصل یہ ایک اصطلاح اور رسم ہے جو بعض علاقوں میں بے حد استعمال ہوتی ہے، اسکا مطلب کسی فرد کا دوسرے فرد سے اظہارِ ناراضگی ہے جو فردِ اول کے کہے ہوئے کام نہ کرنے، شادی اور غمی میں شرکت نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے فرد پر عائد ہوتی ہے۔ اکثر لوگ اس (میار) سے بہت ڈرتے ہیں (اتنا اگر اللہ سے دڑیں تو سیدھے جنت میں جائیں خصوصاً خواتین تو جنت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو جائیں)، اسی لئے ثواب کی نیت کئے بغیر دوسروں کے کام بھی کر دیتے ہیں، ہر میت میں کندھا دینے بھی پہنچ جاتے ہیں اور وارثوں کو اپنا چہرہ دکھانا بھی فرض سمجھتے ہیں، پھر ہر کسی کو بتاتے بھی ہیں کہ ہم جنازے میں پہنچ گئے تھے تو اس طرح وہ (میار) سے بچ جاتے ہیں اور پھر گھروں کو اس طرح واپس لوٹتے ہیں کہ گویا کوئی بہت بڑا قلعہ فتح کر لیا ہو۔ میری اس تنقید کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس رسم (میار) نے لوگوں کو خلوص اور ثواب سے دور کر دیا ہے۔ کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے اور یہاں نیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

خیر بات کہاں سے کہاں چلی گئی، فارم فل کرنے کے بعد اگلا مرحلہ وہاں موجود بینک میں فیس جمع کروانے کا ہوتا ہے، پانچ سال والے پاسپورٹ کی فیس 3000 اور دس سال والے کی پانچ ہزار چار سو، ساتھ میں 25 روپے بینک چارجز بھی جمع کروانے ہوتے ہیں۔ یہاں لمبی قطار ہوتی ہے لیکن جس کاونٹر پر میری فیس جمع ہونی تھی، وہاں اتفاق سے رش کم تھا، لہذا جلدی کام ہو گیا۔

اس کے بعد تیسرا مرحلہ وہاں موجود اپنے ضلع سے متعلقہ دفتر کے باہر لگی لائن میں کھڑا ہونا ہوتا ہے، تاکہ فوٹو بن سکے اور آگے کے مراحل طے ہو سکیں۔ میں بھی جا کر لائن میں کھڑا ہوا تو وہاں مجھ سے آگے عکاظ نامی نوجوان کھڑے تھے، دعا سلام کے بعد ان سے کافی باتیں ہوئیں (جو کہ انکے نام، تعلیم اور سیر و سیاحت کے متعلق تھیں)، اس دوران ہمارا نمبر بھی آ ہی گیا، جب میری باری آئی تو یاد آیا کہ میں تو جلدی میں اپنا اوریجنل شناختی کارڈ بھول آیا ہوں، اس چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے اب ٹوکن ملنا ناممکن تھا، اس بھولنے میں بھی ضرور کوئی بہتری ہی تھی، (بعد میں جب اس بات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ بروز حشر بھی ایک معمولی غلطی کی بنا پر جنت کا ٹوکن نہیں مل

پائے گا اور عین اس وقت جنت کے دروازے سے واپس کر دیا جائے گا، جب ایک قدم کا فاصلہ رہ چکا ہو گا۔ اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے۔ آمین) چنانچہ چند لمحے وہاں کھڑے ہو کر سوچا تو میرے سامنے اب دو راستے تھے، ایک کہ اس معاملے کو کل تک موقوف کیا جائے اور دوسرا یہ کہ ہمت کی جائے اور جا کر ابھی کارڈ لیکر آیا جائے، بہر کیف میں نے دوسرا راستہ اختیار کرتے ہوئے خود سے کہا کہ ابھی نہیں تو کبھی نہیں، جب ارادہ کیا ہے تو تکمیل بھی کر کے چھوڑیں گے، اپنے احباب سے الوداع ہو کر باہر پارکنگ میں کھڑی اپنی اکلوتی گاڑی (بائیک) اسٹارٹ کی، جو کہ yamaha100 کی صورت میں میری راہ تک رہی تھی، کیونکہ یہی میری مہران، کلٹس، ٹوڈی اور لینڈ کلوزر ہے اور ایک وفادار گھوڑے کی طرح دوران سفر ساتھ دیتی ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ میرے ایک ماموں اکرم کو اس کے نام سے ہی شدید نفرت ہے اور اکثر لوگ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس پر سفر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن اس نے ہی میرا ساتھ دیا اور کچھ ہی دیر میں شناختی کارڈ والا قلعہ فتح کر کے واپس پاسپورٹ آفس آ پہنچا، اب چونکہ رش بڑھ چکا تھا لہذا مجھے ٹوکن نمبر 258 ملا۔

اگلا چوتھا مرحلہ ڈیٹا انٹری کا تھا، جو کہ بڑا صبر آزما اور انتظار پر مشتمل ہوتا ہے جس میں ٹوکن نمبر کے آنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے، جب نمبر ز پر نظر ڈالی تو ابھی تقریباً ایک سو بیسواں نمبر چل رہا تھا۔ اس کا مطلب دو گھنٹے کا انتظار، لیکن عملے کی سستی کی وجہ سے یہ انتظار تین گھنٹے سے بھی زیادہ کرنا پڑا تھا، اس انتظار کے دوران کچھ جاننے والوں سے بھی ملاقات کا اتفاق ہوا، تو کچھ انتظار اس طرح کٹ گیا۔ لیکن پھر بھی انتظار تو انتظار ہی ہوتا ہے۔

دوران انتظار مجھے میدان حشر کی یاد بھی آئی کہ وہاں بھی لوگ اس انتظار میں ہونگے کہ کب حساب شروع ہو گا، یہ چند گھنٹے گزارنا مشکل تھا تو وہاں کا اتنا طویل وقت کیسے گزرے گا ؟؟؟ لوگ کہتے پھریں گے کہ جیسا بھی حساب ہو لیکن کم سے کم شروع تو ہو، تاکہ اس انتظار سے تو جان چھوٹ جائے یا تو پھر موت آ جائے۔ اسی لئے تو مشہور ہے کہ (الانتظار اشد من الموت) انتظار موت سے زیادہ کٹھن ہے۔

خیر وہ وقت بھی آ ہی گیا جس کا انتظار تھا کیونکہ انتظار کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو ایک نہ ایک دن ضرور ختم ہو ہی جاتا ہے، کبھی تو منتَظر (جسکا انتظار ہو) مل جاتا ہے اور کبھی منتظِر (انتظار کرنے والا) ہی چل بستا ہے، لیکن دونوں صورتوں میں انتظار کو ختم ہونا ہوتا ہے۔ مجھے جیسے ہی 258 نمبر نظر آیا تو Data Entry کے کاؤنٹر پر پہنچا اور ضروری ڈاکومینٹس چیک کروائے، (جن میں والدین کے اصل شناختی کارڈز، میٹرک کی سند اور بینک کی رسید شامل تھیں) اور ایڈریس اور موبائل نمبر کی انٹری کروائی، وہاں سے ایک کمپیوٹرائز فارم دیا گیا جسے چیک کرنے کا کہا گیا اور پھر بائیں طرف کاؤنٹر پر موجود افسر سے اسٹیمپ لگوائی۔

بروز حشر بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی ہو گا، جس طرح یہاں ڈاکومینٹس چیک ہوئے اسی طرح وہاں پر بھی اعمال چیک کئے جائیں گے اور اس کی بنیاد پر فیصلہ ہو گا کہ جنت کا پاسپورٹ دیا جائے یا کہ نااہل قرار دے کر جہنم میں داخل کیا جائے۔ جیسے

اس دنیا میں پاسپورٹ کے حصول کے لئے اور یجنلNICاور والدین کے اصل کارڈز کے ساتھ ساتھ تعلیمی اسناد اور بینک کی رسید ضروری ہے اسی طرح آخرت میں بھی کامیابی کے لئے اوریجنل ایمان اور سالت کاNIC، نیک اعمال کا سرٹیفکیٹ اور اللہ کی راہ میں خرچ کئے گئے مال کی رسید درکار ہوگی۔(اللہ ہمیں ان کاغذات کو جمع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین)

اب صرف آخری مرحلہ(Assistant Director) کے انٹرویو کا رہ گیا تھا گویا یہ آخری چیک پوسٹ تھی، جس کے لئے مختصر انتظار ابھی باقی تھا۔ لیکن اس مرحلے کے متعلق میرے کزن خدشات کا اظہار کر گئے تھے کہ وہاں موجود افسران میں سے ایک ذرا زیادہ سخت ہے، چھوٹی بات پر بھی فارم کینسل کر دیتا ہے، دوسرے کے پاس نمبر آئے تو آسانی ہوگی،اسی پس منظر میں جب میرا نمبر قریب آنے لگا تو میں بھی دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ یہاں نمبر نہ آئے، نہ آئے اور جب نمبر آیا تو اتفاق سے اسی کے پاس آیا، گویا میری دعا قبول نہ ہوئی تھی۔ لیکن بعض اوقات بلکہ اکثر دعا قبول نہ ہونے میں ہی بہتری ہوتی ہے، لہذا میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، جب میں آفیسر کے پاس گیا تو بغیر کسی پریشانی کے میرا فارم قبول کر لیا گیا، گویا اب مجھے دس دنوں بعد پاسپورٹ مل جائے گا۔اس طرح میں اس محاذ سے کامیاب ہو کر لوٹا اور واپس آکر اپنے کزن کو اپنے ایک استاد کا مقولہ بھی SMS کیا کہ (جان چھوٹی لاکھوں پائے،لوٹ کے بدھو گھر کو آئے)

واضح رہے کہ پاسپورٹ بنانے کا طریقہ نہایت آسان ہے اس کے لئے کسی بھی شخص کو پیسے دینے کی ضرورت نہیں بلکہ وہاں لگے ہوئے بورڈز اور عام لوگوں سے بآسانی رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ جہاں تک بات ہے انتظار کی تو وہ ہر صورت کرنا ہی پڑے گا کیونکہ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔

اسی طرح آخرت میں کامیابی کے لئے دنیا کی محبت اور لذتوں کو قربان کرنا پڑتا ہے، زندگی کے دکھوں پر صبر اور سکھوں پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے زندگی گزارنی پڑتی ہے، تب ہی تو اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں جنت کا پاسپورٹ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ بھی یہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے ڈاکومینٹس مکمل رکھیں اور اپنی باری کا انتظار کریں تاکہ **جب موت کا آفیسر فرشتہ چیک کرے تو پریشانی نہ ہو!!!**

دعا قبول نہ ہونے کی وجوہات

(1)اللہ کا اقرار کرتے ہیں اور اس کا حکم نہیں مانتے(2)رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور آپ کی سنت کی اتباع نہیں کرتے(3)قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے(4)جنت کو پسند کرتے ہیں اور اس کے راستے پر نہیں چلتے(5)جہنم کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کے راستے پر دھکم پیل کرتے ہیں(6)ابلیس کو اپنا دشمن کہتے ہیں اور اسکی موافقت کرتے ہیں(7)لوگوں کو دفن کرتے ہیں اور اپنی موت کو یاد نہیں کرتے(8)اپنے بھائیوں کے عیوب تلاش کرتے ہیں اور اپنے عیوب نہیں دیکھتے(9)مال جمع کرتے ہیں اور حساب کے دن کو یاد نہیں کرتے(10)قبریں کھودتے ہیں پھر بھی عالیشان مکان بناتے ہیں۔(تفسیر تبیان القرآن، ج1ص702) از:۔غلام مصطفیٰ 2nd year

تقابل ادیان کے بنیادی اصول

مقصود حسین (3rd year)

یورپی مؤرخین عام طور پر تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ جن میں **پہلا دور** رومی شہنشائیت (Roman Empire) کے سقوط سے قبل کے دور کو تاریخ کا اولین دور قرار دیا جاتا ہے۔ رومی شہنشائیت (Roman Empire) کو قدیم دور کی عظیم سلطنت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رومی شہنشائیت نے قدیم دور کی غالب تہذیب جس کی بنیاد محض توہم پرستی (Superstition) اور جبر کے اصولوں پر رکھی گئی تھی، کو جنم دیا تھا۔ تاریخ کے اس اولین دور کا اختتام ساتویں صدی میں عربوں کے ہاتھوں ہوا جس سے نہ صرف وقت کی غالب سیاسی قوت کا نظم بکھر گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے تہذیبی و ثقافتی غلبے (Cultural domination) کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

دوسرا دور: رومی سلطنت اور تہذیب کے خاتمہ سے لے کر پندرھویں صدی کے آخر تک کے عرصے کو تاریخ کا دوسرا دور قرار دیا جاتا ہے جو قرونِ وسطیٰ (Middle Age) کہلاتا ہے۔ یہ وہ درمیانی دور ہے جس کے آغاز کے ساتھ ہی مغربی دنیا قدیم دور سے نکل کر جدید دور میں داخل ہوئی۔

تیسرا دور: تاریخ کے تیسرے دور کی ابتدا سولہویں صدی کے آغاز سے ہوئی۔ تاریخ کا یہ دور (Modern Age) دورِ جدید کہلاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس کے آغاز سے مغربی دنیا میں ہمہ گیر سیاسی، جمہوری، صنعتی، سائنسی اور علمی و فکری انقلاب برپا ہوا اور اس طرح تمام مغربی اقوام نے غیر سائنسی دور سے نکل کر بھرپور سائنسی فکری انقلاب کے دور میں قدم رکھا۔ دورِ جدید (Modern Age) کے آغاز سے مغربی دنیا میں برپا ہونے والے ہمہ گیر سائنسی و فکری انقلاب نے آتے ساتھ ہی مغرب میں مذہبی طبقہ کی طویل سماجی و معاشرتی اجارہ داری ختم کر دی۔ یہاں تک کہ خود مذہب کے وجود کے لئے بھی خطرے کی گھنٹی بجادی۔ کئی ایک سائنسدانوں نے مذہبی (عیسوی) عقائد و نظریات اور افکار کو اپنی سائنسی تحقیق (Scientific Research) کا موضوع بنایا اور مجموعی طور پر مذہب کی علمی و فکری حیثیت کو باقاعدہ سائنسی اصولوں (Scientific Laws) کی روشنی میں چیلنج کیا گیا۔ نتیجتاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب مذہب (عیسائیت) بھرپور سائنسی تحقیقات (Scientific Research) کے نتیجہ میں دریافت شدہ حقائق وانکشافات کا سامنا نہ کر سکا۔ اس طرح مذہبی (عیسوی) نظریات وافکار اور دریافت شدہ سائنسی حقائق وانکشافات کے مابین تعارض و تناقض مذہبی (عیسوی) اور سائنسی فکر کے درمیان تاریخی تصادم و ٹکراؤ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس طرح دونوں طبقہ ہائے فکر میں باہمی تاریخی تعصب، نفرت وعداوت اور تنگ نظری کی بنیاد پڑی جسکا اظہار

اس وقت کے نسبتاً طاقتور مذہبی طبقے نے سائنسدانوں کو مذہب سے خارج قرار دے کر تختہ دار پر لٹکا کر کیا، جب کہ سائنسی طبقہ فکر نے رد عمل کے طور پر مذہبی (عیسوی) تصورات کے یکسر مخالف نظریات کو سائنسی انداز (Scientific Method) میں ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

اس سلسلے میں چارلس ڈارون(Charles Darwin) کے نظریۂ ارتقاء کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے جس کے مطابق انسان اپنی موجودہ شکل و صورت تک مختلف ارتقائی مراحل(Evolutionary Stages) سے گزر کر پہنچا ہے نیز انسان، مذہبی تصور کے برخلاف ،بندر کی اعلیٰ ارتقائی صورت ہے۔ظاہر ہے کہ چارلس ڈارون (Charles Darwin) کا نظریہ ارتقاء(Theory of Evolution) کوئی ٹھوس سائنسی اور تحقیقی حقائق پر مبنی نظریہ نہ تھابلکہ محض مذہبی تصورِ تخلیقِ انسان جس کے مطابق خدانے انسان کو اپنے پرتو کے مطابق تخلیق کیا ہے۔

God has created man in his own image.

کے خلاف تاریخی نفرت اور عداوت کا اظہار تھا جس کا بیج خود عیسائی چرچ(Church) نے بویا تھا۔اس طرح مغربی دنیا میں مذہبی اور سائنسی فکر کے مابین ہونے والا یہ تاریخی تصادم اور ٹکراؤ مغربی معاشرے سے مذہب کے مکمل خاتمے پر منتج ہوا یہاں تک کہ سائنسی اصول و ضوابط بالاتفاق تمام روایتی اور مذہبی نظریات کو پرکھنے کے لیے معیار ومیزان قرار پائے۔ نتیجۃً مذہب (عیسائیت) کے انسان، کائنات اور خدا سے متعلق مذہبی تصورات کو بہت بڑا دھچکا لگا حتی کہ مذہبی علماء کو دفاعی موقف اختیار کرتے ہوئے مذہب کی ایک نئی تعبیر و تشریح اس نعرہ سے کرنی پڑی۔

It's a divine mystery, believe it , you will be saved.

تقابل ادیان و مذاہب کی اصولی بنیادیں ذکر کرنے سے پہلے ہم نے مذہب اور سائنس کے باہمی تاریخی پس منظر کو تمہید کے طور پر ذکر کرنا ضروری سمجھا ہے کیونکہ جب ہم مذہب کو دور جدید و قدیم کی تاریخ کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو تقابل ادیان و مذاہب کے اصول و قوانین متعین کرنے کے سلسلہ میں انسانی طبیعت کے دوبنیادی عناصر ہمارے سامنے آتے ہیں۔جن کی تائید وتوثیق قرآن حکیم اس آیت کریمہ میں بھی کرتا ہے۔فرمایا(انه كان ظلوما جهولا۔)بے شک انسان ظالم اور جاہل ہے۔(القرآن)

پیش نظر آیت کریمہ حق کو قبول کرنے کے متعلق انسانی طبیعت کے دوبنیادی عناصر یعنی ظلم(Injustice)اور جہالت (Ignorance)اور مختلف تاریخی ادوار میں ان کے اظہار کے متعلق تاریخی جامعیت ومانعیت کا درجہ رکھتی ہے۔

مذکورہ دو عناصر یا کمزوریاں انسانی رویئے میں اس کی انتہائی خلقت (Creation) میں موروثی (Inherent) یا طبعی (Natural) ہیں۔جب انسان ان دونوں رویوں یا دونوں میں سے ایک رویئے کے طبعی تقاضے ، جو کہ ظلم کی صورت میں عدل (Justice) اور جہالت کی صورت میں علم

(Knowledge) ہے۔ تشفی نہیں کرتا تو نتیجتاً اس کا مجموعی رویہ و طرزِ عمل حقیقی (Realistic) اور سائنسی (Scientific) اپروچ اختیار کرنے کے بجائے جذباتیت اور ردعمل کی نفسیات پر قائم ہوجاتا ہے۔ مختلف افکار و نظریات اورادیان ومذاہب کے منصفانہ تقابل و موازنہ کے لیے ان دو طبعی تقاضوں کی آبیاری کرنا شرط اول کی حیثیت رکھتا ہے۔

ماقبل میں ذکر کیے گئے مذہب (عیسائیت) اور سائنس کے مابین واقع ہونے والے تاریخی تصادم و تعارض کا انتہائی سبب بھی دونوں طبقہ ہائے فکر میں فطرتاً موجود حیوانی یا پست عناصر (Lower Yearning) ہی ہیں جس کی وجہ سے ہر دو طبقہ فکر نے انصاف اوراعتدال کے طریق کو ترک کرتے ہوئے ظلم و تشدد اور جہالت کے راستہ کو اپنا کر دونوں نے اپنے آپ کو حق کی ابدی سعادتوں وبرکتوں سے محروم رکھا۔

مذہبی طبقے نے اپنی طویل سماجی و معاشرتی اجارہ داری کے تحفظ کے لیے جہالت کو اپنا ہتھیار بنایا اور علم کے حصول اور حق کی تلاش کو اپنے من پسند افکار و نظریات کے لیے واضح خطرہ تصور کیا۔ اس تاریخی حقیقت کو مشہور مورخ Marmaduke Picthall نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

Learning was for them a devil's snare

beloved to pagans.

جب کہ دوسری طرف سائنسی طبقہ فکر نے ظلم (injustice) کے طریق کو اختیار کرتے ہوئے کائنات کے سربستہ رازوں کی دریافت کے بجائے اپنی تمام تر تحقیقات کا سارا زور مذہبی (عیسوی) افکار وتصورات کو باطل ثابت کرنے پر لگادیا۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء اس حوالے سے بطور مثال پیش کیاجاچکا ہے۔ یوں دونوں طبقہ ہائے فکر نے باہم متصادم و متعارض فکری شدت پسندی کو فروغ دینے میں بنیادی کردار اداکیا۔ موضوع کی طرف آتے ہوئے بیان کیاگیا تاریخی پس منظر اس بات پر شاہد ہے کہ تقابل افکار و نظریات اورادیان ومذاہب ایک نہایت کٹھن اور سخت مشکل کام ہے کیونکہ انسان بلا تحقیق و تنقید اکثر اوقات اپنی طبعی وفطری کمزوریوں کے باعث تعصب وتنگ نظری کا شکار ہوکر اپنے عقیدے اور رائے کو حق قرار دیتا ہے اور اس کے برعکس افکار وآراء کو شعوری یالاشعوری طور پر مبنی بر باطل تصور کرتا ہے۔

تقابل ادیان و مذاہب کی اہمیت اور مضمون کی دقت واضح ہونے پر راقم کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اس شعبے کے متبدی متعلمین کی راہنمائی کے لیے ایک مختصر کتابچہ تصنیف کرے لیکن نامساعد حالات کے پیش نظر اپنا تحقیقی کام مختصر مضمون کی صورت میں شائع کررہا ہے تاکہ اس کام کی طرف پہلا قدم ممکن ہوسکے۔ اس سلسلے میں ہم تقابل ادیان کے چار بنیادی اصولوں کو مناسب اصطلاحات دے کر ذکر کریں گے تاکہ علمی و تحقیقی معیار پر پورا اتر سکیں۔

تقابل ادیان:

تعریف: مختلف ادیان و مذاہب کا باہم تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ان کے تصورات کا غیر متعصبانہ وغیر جانبدارانہ موازنہ اور ان کی تعلیمات کا عادلانہ ومنصفانہ مطالعہ و تحقیق تقابل ادیان

کہلاتا ہے۔

تقابل ادیان کے بنیادی اصول:

حق: ایک موجود حقیقت (Truth: an existing reality)

بلاشبہ کائنات کے نظام میں سنجیدہ غورو فکر ہمیں جس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے وہ یہ کہ کائنات میں موجود ہر نظام اپنے مخصوص دائرہ کار میں خاص حکمت و منصوبہ بندی (plan and program) کے اصول کے تحت عمل کر رہا ہے اور حکمت و منصوبہ بندی کا یہ اصول ناقابل یقین حد تک اس تمام تر نظام کائنات میں حیرت انگیز اعتدال و توازن قائم کیے ہوئے ہے حتی کہ اگر ایک لمحہ بھر کے لئے یہ توازن واعتدال بگڑ جائے تو یقینی طور پر یہ سارا آفاقی نظام چند لمحوں کے اندر تباہ (Crash) ہو جائے گا۔ منصوبہ بندی و حکمت کائنات کے آفاقی نظام و انصرام کی اصل ہے، جو اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ کائنات کے اس نہایت ہی دقیق و عمیق نظام اعتدال و توازن کا ایک خالق (Creator) اور مربی ہے جو اس پورے آفاقی انتظام وانصرام کا چلانے والا ہے۔ اور جب یہ ظاہر ہوا کہ کائنات کے پورے آفاقی نظام میں خدائی حکمت و منصوبہ بندی Divine plan and program کا اصول کارفرما ہے تو پھر انسان کے متعلق خدائی منصوبہ Divine plan کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں مختلف مذہبی کتب میں ملتا ہے جن کا دعویٰ ہے کہ انسان کے متعلق خدائی منصوبہ Divine plan ان میں موجود ہے۔ یہ وہ نقطہ آغاز ہے جو حق یعنی انسان کے متعلق خدائی منصوبہ Divine plan کے ہمیشہ موجود ہونے پر مختلف دلائل و شواہد مہیا کرتا ہے اور انسان پر اس کی تلاش و جستجو لازم کرتا ہے۔ یہ حقیقت تقابل ادیان و مذاہب کا پہلا اصول ہے۔

حق: ایک وحدت (Truth: a singular reality)

نظام کائنات میں غوروتدبر کرنے سے جو دوسرا نقطہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حق ہمیشہ ایک وحدت رہا ہے کیونکہ ایک وقت میں کوئی چیز متضاد مادی خصوصیات (Physical Properties) کی حامل نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر اگر تین مختلف اشخاص ایک وقت میں یہ دعویٰ کریں کہ کسی خاص چیز کا رنگ ہر ایک کے مطابق بالترتیب سفید، سیاہ اور سرخ ہے تو اس چیز کے متعلق تینوں اشخاص کا طرز عمل بھی مختلف ہو گا جو کہ بیان کئے گئے اصول کی روشنی میں غلط ہو گا۔ اسی لیے امام فخر الدین رازیؒ نے فرمایا(الحق لایکون الا واحدا وماعداہ یکون جهلا و ضلالا)۔ بالکل اسی طرح انسان کے بارے میں خدا کا ابدی منصوبہ یعنی حق ہمیشہ ایک ہو گا اس میں وحدت (Unity) ہو گی کہ دوہیت (Duality)

اس طرح وحدت حق تقابل ادیان و مذاہب کا دوسرا بنیادی اصول بن کر سامنے آتا ہے کہ انسان اپنے نظریات وافکار کا سنجیدہ تحقیقی وتنقیدی جائزہ لے کر حق واحد کو اپنی ابدی فلاح و کامیابی کے لیے اپنا لے اور دوسروں کے لیے اس کی روشنی کو واضح تر کرنے کی کوشش کرے۔

حق: ایک آفاقی حقیقت (Truth: a universal reality)

حق (انسان کے متعلق خدائی منصوبہ) ایک آفاقی حقیقت ہے۔

یہ کسی قوم کسی قبیلے یا کسی خاندان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ ایک عالمگیر وآفاقی قدر ہے۔ مذہب انسانی تاریخ میں ہر نئی تہذیب وثقافت کے ہر مرحلے پر ایک بھرپور ثقافتی قدر کے طور پر شمار کیا گیا ہے۔ اس تاریخی حقیقت کو مغرب کے مایہ ناز مورخ آرنلڈ ٹائن بی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"مذہب انسانی تاریخ کے درمیان کھڑا نظر آتا ہے"۔ قرآن حکیم نے بھی اس تاریخی حقیقت پہ سورہ رعد میں مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ (لکل قوم ھاد) (الرعد:۷) یعنی ہر قوم کیلئے ایک راستہ دکھانے والا ہے۔ خالق کائنات نے ہر قوم کے کئے حق کی وضاحت کا بھرپور انتظام کیا ہے، لیکن مرور زمانہ اور مختلف ثقافتوں کے آپس میں ٹکراو کے باعث حق کا تشخص باقی نہ رہا۔ لہذا یہ کہنا کہ حق صرف اور صرف ایک ہی مذہب میں مقید ہے بالکل غلط ہو گا کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حق و صداقت کی روشنی کم وبیش ہر جگہ اور ہر زمانہ میں موجود تھی جس کا اظہار مختلف تاریخی ادوار میں ہوتا رہا ہے۔ البتہ جب ہم مختلف ادیان ومذاہب کا تقابلی مطالعہ اور تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ہمارا مقصد و مطمع نظر، یہ ہوتا ہے کہ حق جو ایک آفاقی حقیقت ہے، کے مظہر اتم کا تعین کیا جائے اور لوگوں کے لئے اس کی حقانیت و صداقت کو خوب واضح اور روشن کیا جائے لہذا تقابل ادیان کے متعلم کو مکمل تحقیق وتنقید کے مرحلے سے قبل یہ فرض نہ کرلینا چاہئے کہ اس کا اختیار کردہ مذہب حق کا مظہر اتم ہے اور اس کے برعکس باقی تمام مذاہب حق کی روشنی سے خالی ہیں بلکہ اسے یہ تصور کرنا چاہئے کہ حق اور باطل باہم خلط ملط (intermixed) ہیں اس کا کام حق کی روشنی کو باطل کی تاریکی سے علیحدہ کرنا اور دونوں کو خلط ملط ہونے سے بچانا ہے۔

حق: ایک کلی حقیقت (Truth: a total reality)

حق (خالق کائنات کا انسان کے متعلق ابدی منصوبہ) اپنے وجود کے اعتبار سے ایک کلی حقیقت ہے۔ ہر دور میں اس کلی حقیقت کا منبع وسرچشمہ وحدت حق کے اصول کے مطابق واحد رہا ہے۔ حق کی اس کلی حقیقت کا زمان و مکان کی تبدیلی کی بناء پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حق کے پیروکار جہاں کہیں بھی ہوں وہ اس کلی حقیقت کے جزء کے طور پر شمار کئے جائیں گے۔ اس لئے تقابل ادیان ومذاہب کے متعلم کو اس حقیقت کا بطور خاص خیال رکھنا چاہئے کہ زمان و مکان کی تبدیلی سے حق کی اصلیت و حقیقت نہیں بدلتی۔ جو حق آپ کے اختیار کردہ مذہب میں موجود ہے وہی حق دوسری جگہ بھی موجود ہو سکتا ہے۔ اور حق کا ایک سے زیادہ جگہ پایا جانا ان دونوں مذاہب میں کسی ایک مذہب کے نقص کی دلیل نہیں بلکہ دراصل یہ تو اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں مذاہب وحدت حق کے اصول کے تحت ایک مشترک سرچشمہ حق سے ماخوذ ہیں۔

اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ جب ایک مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کو دوسرے مذہب کے بالمقابل تقابلی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو وہ جہالت، ظلم اور تعصب کا شکار ہو کر اپنے مذہب کے روشن پہلوؤں کا جب کہ دوسرے مذہب کے تاریک پہلوؤں کا باہم موازنہ کرکے اپنے مذہب کو مبنی بر حق ثابت کرنے کی

کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل تقابل ادیان کے طلباء کے شایان شان نہیں لہذا انہیں چاہیئے کہ اپنی تحقیق و تنقید کو احقاق حق اورابطال باطل کے مقصد کے لیے استعمال کریں۔ اس کے علاوہ ابتدائی تحقیق کے دوران اس بات کا بطور خاص اہتمام کرنا چاہیئے کہ مخالف مذہب کے مخالفین اور متبعین دونوں کی تصنیفات کے مطالعہ سے گریز کیا جائے اور حتی الامکان اس مذہب کے ماخذ اصلیہ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے کر کسی رائے یا نتیجہ تک پہنچا جائے۔

آخر میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں التجاء ہے کہ وہ ذات حق ہمیں احقاق حق اورابطال باطل کا مقدس فریضہ عمدگی کے ساتھ انجام دینے کی ہمت وتوفیق عطافرمائے اور ان ناقص سطور کو اپنی بارگاہ میں قبول فرماتے ہوئے راقم کے والدین کے لیے ابدی صدقہ جاریہ بنائے۔

آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علی النبی الامی وعلی آلہ واصحابہ اجمعین الی یوم الدین

کامیاب زندگی

ایک بیٹے نے باپ سے پوچھا– پاپا یہ 'کامیاب زندگی' کیا ہوتی ہے ؟والد، بیٹے کو پتنگ اڑانے لے گئے. بیٹا باپ کو غور سے پتنگ اڑاتے دیکھ رہا تھا... تھوڑی دیر بعد بیٹا بولا، پاپا.. یہ دھاگے کی وجہ سے پتنگ اور اوپر نہیں جا پا رہی ہے، کیا ہم اسے توڑ دیں!! یہ اور اوپر چلی جائے گی... والد نے دھاگہ توڑ دیا.. پتنگ تھوڑا سا اور اوپر گئی اور اس کے بعد لہرا کر نیچے آئی اور دور انجان جگہ پر جا کر گر گئی. تب باپ نے بیٹے کو زندگی کا فلسفہ سمجھایا، بیٹا 'زندگی میں ہم جس اونچائی پر ہیں.. ہمیں اکثر لگتا ہے کہ کچھ چیزیں، جن سے ہم بندھے ہوئے ہیں وہ ہمیں اور اوپر جانے سے روک رہی ہیں جیسے: مذہب، گھر، خاندان، نظم وضبط، والدین وغیرہ اور ہم ان سے آزاد ہونا چاہتے ہیں... اصل میں یہی وہ دھاگے ہوتے ہیں جو ہمیں اس اونچائی پر بنا کے رکھتے ہیں.. ان دھاگوں کے بغیر ہم ایک بار تو اوپر جائیں لیکن بعد میں ہمارا وہی حشر ہو گا جو بن دھاگے کی پتنگ کا ہوا. "لہذا زندگی میں اگر تم بلندیوں پر بنے رہنا چاہتے ہو تو، کبھی بھی ان دھاگوں سے رشتہ مت توڑنا.. "" دھاگے اور پتنگ جیسے تعلق کے کامیاب توازن سے ملی ہوئی اونچائی کو ہی 'کامیاب زندگی' کہتے ہیں بیٹا".

علامہ سعیدی بحیثیت مجتہد

حبیب الرحمن(4th year)

عالم اسلام کے ممتاز اور جلیل القدر عالم حضرت علامہ ابوالوفاء غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ برصغیر پاک وہند میں گذشتہ صدی میں تفسیرِ قرآن اور قرآن فہمی کے حوالے سے جو بھی نام لئے جاسکتے ہیں ان میں علامہ سعیدی کا اسم مبارک سرفہرست نظر آئے گا۔

علامہ غلام رسول سعیدی وہ نابغہ روزگار اوراس دور کی وہ عظیم ہستی تھے جن کا علمی فیض ان شاء اللہ تاقیامت جاری رہے گا۔ اللہ رب العزت نے آپ کو بے پناہ علمی استدلال اور فقہی بصیرت عطافرمائی تھی۔ جس طرح آپ فن تدریس میں ماہر تھے اسی طرح تصنیف وتحریر میں بھی آپ کو بلند مقام حاصل ہے۔ آپکی تصانیف درج ذیل ہیں:

1۔ تذکرۃ المحدثین، 2۔ توضیح البیان، 3۔ مقاماۃ الولایۃ والنبوۃ 4۔ تاریخ نجد و حجاز، 5۔ مقالات السعیدی، 6۔ حیاۃ استاذ العلماء، 7۔ ذکر بالجھر، 8۔ ضیاء کنز الایمان، 9۔ معاشرہ کے ناسور، 10۔شرح الصحیح المسلم(8 جلدیں)، 11۔ تبیان القرآن (تفسیر 12 جلدیں)،12۔ نعمۃ الباری (شرح صحیح البخاری 16 جلدیں)،13۔ تبیان الفرقان

علامہ سعیدی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تمام تصانیف علمی تحقیق کے زیور سے آراستہ ہیں۔ آپ کی تفسیر واحادیث نبوی کی شروحات دنیائے علم میں گراں قدر اضافہ ہے۔ قرآن وحدیث کی یہ خدمت مسلمانوں کے لئے ایک عظیم تحفہ ہے۔ جہاں علامہ نے قرآن و حدیث کی شرح میں ہر قدیم و جدید موضوع پر سیر حاصل اور جامع بحث کی ہے،اسی طرح آپ نے اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو استعمال کرکے اس عقیدہ جمود کو توڑا جو اہل اسلام کے دلوں میں اجتہاد کے بند ہونے کی صورت میں پیدا ہوگیا تھا۔ آپ نے ہر مشکل وعصری مسئلہ میں براہین ودلائل کی بنیاد پر اپنا موقف بیان کرنے میں جو اجتہادانہ جوہر پیش فرمائے تاکہ امت "اختلاف امتی رحمۃ" کی برکات سے فیض یاب ہوتی رہے۔ اوردین اسلام کی یہ فقاہت دنیا اسلام پر نمایاں ہوجائے کہ اسلام ہر زمانے کے مسائل کا بھرپور حل پیش کرتاہے۔ علامہ سعیدی جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں براہین ودلائل کے انبار لگادیتے ہیں۔ وہ کسی بھی مسئلے پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بجائے بحث وتحقیق کی انتہاء کو پہنچتے ہیں۔ مسئلہ کی تنقیح اور تفصیل پر آتے ہیں تو دریا کی روانی اور سمندروں کی گہرائی کی وسعت کا اندازہ ہوتاہے اوراس کے ساتھ ساتھ متقدمین فقہاء کے ساتھ اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتاہے کہ اختلاف تھاہی نہیں۔

زیر مطالعہ مضمون علامہ سعیدی کی ان ہی منفرد صلاحیتوں اور علمی قوت کا اختصار ہے۔ یہ آپ کی وہ چند تحقیقات ہیں جو آپ کی صرف ایک تصنیف "شرح صحیح مسلم" میں مختلف مقامات پر

موجود ہیں۔

1۔انعامی بانڈز پر علامہ سعیدی علیہ الرحمہ کی تحقیقات:

علامہ سعیدی نے انعامی بانڈز کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی ہے،چونکہ دور حاضر میں انعامی بانڈز کا اجراء بڑی تیزی سے چل پڑا ہے۔اس لیے اس امر کی اشد ضرورت تھی کہ شرعی احکام انعامی بانڈز کے حوالے سے واضح کر دیئے جائیں تا کہ مسلمان قلبی وذہنی اطمینان کے ساتھ اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔اور اگر عدم جواز کی صورت ہو تو اس کے اجراء کے عمل کو بند کیا جائے۔

مولانا غلام رسول سعیدی فرماتے ہیں:

جب مجھ سے چند احباب نے اس پر تحقیق کے لئے کہا تو میں نے اس کے لئے مولانا مودودی کے عدم جواز کے فتوی اور جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاون سے ایک مفصل دستی فتویٰ منگوایا۔

ان فتاویٰ جات کا مکمل متن شرح صحیح مسلم جلد (4) صفحہ 112 پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں صرف ان فتاویٰ جات کے ان نکات کو لکھ رہا ہوں جن پر علامہ سعیدی علیہ الرحمہ نے بحث کی ہے۔مولانا مودودی کے فتویٰ کے نکات:۔

(1) حکومت عوام کو بانڈز دے کر اس کے عوض ان سے قرض لیتی ہے۔(2) عوام کی رقم سے سود جمع کر کے قرعہ اندازی کے ذریعے چند لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔(3) اس میں سود بھی اور روح قمار بھی۔(4) چونکہ قرض دینے والا لالچ دے کر لوگوں کو قرض دینے پر آمادہ کرتا ہے اس لئے اس میں سودی لین دین کی نیت ہوتی ہے۔

علامہ دیوبند کا موقف:

(1) بینک عوام سے رقم لے کر بانڈز دیتا ہے اس رقم کو بینک کسی شخص یا ادارے کو بطور سودی قرض دیتا ہے اور اس پر سود کی جو رقم موصول ہوتی ہے بینک اس میں سے کچھ رقم رکھ کر باقی انعام کے نام پر لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔(2) کل قرض جر نفعا فھو حرام۔ہر وہ قرض جس کے ذریعے نفع کمایا جائے وہ حرام ہے۔3۔حامل بانڈز چونکہ نفع کی شرط نہیں لگاتا لہذا فقہ کے اس قاعدے کی رو سے کہ "اگر مقروض بطور انعام کے قرض خواہ کو اصل قرض پر کچھ اضافہ کر کے دے تو جائز ہے"۔ جائز نہیں ہو سکتا۔اس لئے کہ فقہ کا ایک اصول ہے کہ "المعروف کالمشروط" کہ جو چیز معروف ہو وہ مشروط کی طرح ہے اگرچہ بانڈز ہولڈر نفع کی شرط تو نہیں لگاتا لیکن وہ نفع کا متقاضی ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو کوئی انعامی بانڈز ہی نہ خریدے۔

4۔بالفرض بینک بانڈز کی رقم سودی کام پر نہ لگائے اور اس سے جائز کاروبار کرے تو اس کا نفع بھی لوگوں کے لئے جائز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ مشارکت نفع و نقصان کی بنیاد پر جائز ہوتا ہے یہاں تو نقصان کا اندیشہ ہی نہیں ہے لہذا انعامی بانڈز کا انعام ہر اعتبار سے ناجائز و حرام ہے۔ اگرچہ بینک اسے انعام ہی کہتا رہے۔

علامہ سعیدی کی مجتہدانہ تحقیق: علامہ سعیدی نے ان فتاویٰ جات کو مکمل طور پر نقل کرنے کے بعد ایک ایک شق پر محققانہ بحث کی ہے۔ اور اپنے دلائل سے بھرپور موقف پیش کیا کہ ہمارے نزدیک انعامی بانڈز کی بیع جائز ہے۔ حکومت کی طرف سے اسے خریدنے کے لئے جو انعام جاری کیا جاتا ہے وہ بھی بالکل جائز ہے

کیونکہ اس انعام پر ربوٰ یا قمار کی تعریف صادق نہیں آتی۔اس سب بحث میں علامہ سعیدی نے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی اور فقہاء کی تعریفات ربوٰ کو بیان کیا ہے۔

مولانا مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ اس میں روح قمار موجود ہے اس کا رد کرتے ہوئے علامہ سعیدی نے فرمایا کہ سید مودودی لکھتے ہیں کہ بانڈز کے انعامات کی تقسیم لاٹری کی طرز پر ہوتی ہے یہ بعینہ قمار تو نہیں لیکن اس میں روح ضرور موجود ہے آیئے یہ دیکھیں کہ قمار کیا چیز ہے۔پھر اس کا فیصلہ ہوگا کہ اس میں قمار کی روح موجود ہے یا قمار کا جسم۔اس کے بعد علامہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ دس کتابوں سے قمار کی کی لغوی واصطلاحی تعریفات وتصریحات بیان کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جس میں جانبین سے شرط ہو یعنی جس عقد یا کھیل یا عقد میں ہر فریق کو فائدہ ونقصان لازم ہو وہ قمار ہے۔پھر آگے چل کر فرمایا کہ قمار کی تعریف معلوم ہوجانے کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ انعامی بانڈز کے انعامات پر قمار بالکل نہیں ہوگا کیونکہ اس پر قمار کی شرط بالکل نہیں پائی جاتی۔

کیا انعام کا رواج خریدار کے شرط لگانے کے مترادف ہے اس حوالے سے بیان کیا جانے والا قاعدہ "المعروف کالمشروط" کے متعلق ارشاد فرمایا کہ یہ دلیل انتہائی سطحی ہے۔حکومت کسی خاص خریدار کو اصل رقم سے کچھ زائد ادا کرتی ہے تو پھر بانڈز خریدتے وقت خریدار نہ تو شرط لگاتا ہے نہ عرف کی وجہ سے اس کی شرط تسلیم کی جاتی اور زیادتی سود ہوتی۔جیسا کہ سیونگ یا ڈیفنس سرٹیفکیٹ وغیرہ۔

مولانا مودودی صاحب نے اپنے فتویٰ میں لکھا کہ جو شخص انعامی بانڈز خریدتا ہے اس میں نیت سودی لین دین ہی کی ہوتی ہے۔علامہ سعیدی نے لکھا کہ حکومت یہ انعام سود کے عنوان سے نہیں دیتی نہ اس پر سود کی تعریف صادق آتی ہے۔پھر تمام مسلمانوں کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سود جیسی حرام چیز کے لین دین کی نیت کرتے ہیں، مسلمانوں کے بارے میں سوء ظن کے سوا کچھ نہیں۔نیت مخفی اور غیب ہے۔ان تمام مسلمانوں کی نیت کے بارے میں ایسا حکم لگانا نہایت حیرت انگیز ہے۔

یہ مولانا سعیدی کی بانڈز کے بارے میں تحقیق کا خلاصہ اختصاراً کیا گیا ہے۔اس کی مکمل تفصیل شرح صحیح مسلم (4) میں دیکھی جاسکتی ہے۔آپ علیہ الرحمہ کی اس تحقیق کی بدولت سینکڑوں علماء وفقہاء کرام نے آپ کی اقتداء میں انعامی بانڈز کے جواز میں فتاویٰ صادر کئے ہیں۔

ریل گاڑی میں نماز پر علامہ سعیدی کا مجتہدانہ مؤقف:

علامہ سعیدی صاحب نے اپنی تصنیف شرح صحیح مسلم کی جلد 2، کتاب صلوٰۃ المسافر میں جس سواری اور کشتی پر نماز کے جواب میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔چونکہ یہ سواریاں خود نبی کریم ﷺ کے دور اقدس میں موجود تھیں۔لہٰذا اس پر فقہی مسائل اور اس کے نظائر موجود تھے۔جب کہ ریل گاڑی جہاز اور نان اسٹاپ بسز بعد کے دور کی ایجاد ہیں۔لہٰذا اس پر نماز پڑھنے کے حوالے سے بھی اطمینان بخش تحقیق کی اب تک ضرورت تھی۔اس مسئلہ میں بھی علامہ سعیدی نے ایک منفرد طرز استدلال اپناتے ہوئے مدلل تحقیق فرمائی ہے۔

اس سے پہلے بھی فقہاء کرام نے ضرورتاً اس پر نماز پڑھنے کی اجازت دی لیکن ساتھ ساتھ واجب الاعادہ قرار دیا۔

علامہ سعیدی علیہ الرحمہ نے 10 صفحات پر مشتمل 33 حوالہ جات کے ساتھ محققانہ بحث کرنے، مجتہدانہ صلاحیتوں کا اظہار

کرنے کے بعد فرمایا "جب ٹرین میں نماز کا وقت آجائے تو نماز پڑھنی چاہئے۔ اسے لوٹانے کی ضرورت نہیں اگر نماز کے پورے وقت میں ٹرین نہیں رکی تو اس صورت میں ٹرین میں نماز پڑھنا فرض ہے۔ اور اس کا ترک فرض کا ترک یعنی گناہ کبیرہ ہے۔

اس رائے کو قائم کرنے کے بعد علامہ سعیدی نے فقہ کے بنیادی چار اصولوں سے استدلال فرمایا: پہلا قرآن کی آیت "فان خفتم ۔۔(سورۃ بقرۃ) دوسرا ترمذی کی حدیث جس میں حضور ﷺ نے کیچڑ جس میں اترنے کی دشواری کی کی وجہ سے نماز پڑھائی۔ تیسرا استدلال اجماع سے، کہ خوف کی وجہ سے سواری پر نماز پڑھنے اور بعد میں نہ لوٹانے پر امت کا اجماع ہے۔ چوتھا استدلال قیاس ہے۔ جو آپ نے تفصیلات کے ساتھ کیا ہے۔ اولاً کشتی پر قیاس اور پھر چوپایہ پر۔

جب آپ علیہ الرحمۃ نے دلائل و براہین سے یہ بات ثابت کر دی کہ ریل گاڑی میں نماز پڑھنا اور بعد میں نہ لوٹانا جائز ہے تو پھر اس مسئلہ پر قیاس فرماتے ہوئے آپ نے ہوائی جہاز پر نماز پڑھنے کا حکم بھی وہی فرمایا جو ریل گاڑی کا ہے۔

مذکورہ بالا یہ دو مسائل علامہ سعیدی صاحب کی مفصل و مدلل تحقیق واجتہاد کا اختصار ہیں او ران مسائل کی تفصیل ودلائل وتحقیقات شرح صحیح مسلم میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں جو کہ علامہ علیہ الرحمۃ کی علمی کاوشوں اور وسعتوں کا آئینہ دار ہے۔

علامہ سعیدی علیہ الرحمہ کی تحقیقات واجتہادات آپ کی تصنیفات میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ راقم المضمون نے نقط اجمالی طور پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ آپ نے جن جدید ومشکل مسائل کو حل فرمایا اور دلائل سے ثابت فرمایا ان میں مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ آلات قصاص، 2۔تصویر وفوٹوگرافی، 3۔اعضاء کی پیوند کاری، 4۔ مسائل رجم 5۔ مسئلہ کفایت،6۔قبضہ داڑھی کے مسائل،7۔ برتھ کنٹرول ،8۔انسان پر جنات کا حلول،9۔ الکحل کے مسائل،وغیرہ

المختصر ان تحقیقات کے علاوہ بھی دوسری تحقیقات ہیں۔ نیز علامہ سعیدی نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس موضوع کی تمام تر ذہنی وفکری الجھنوں کو سلجھادیا۔ آپ نے اپنا موقف پیش کرنے کے بعد کم از کم 10 سے 15 دلائل پیش کرتے ہیں۔ یہ آپ کی علمی جلوہ نمائی کی اعلیٰ مثال ہے۔

علامہ سعیدی علیہ الرحمہ کی مدلل تحقیقات نے امت مسلمہ کے کئی مسائل والجھنوں کو حل فرمایاہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ رب تعالیٰ علامہ سعیدی علیہ الرحمہ کو اجر عظیم عطا فرمائے، آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام اوران کی علمی برکات سے ہم سب کو مستفیض فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم

سلام کی فضیلت واہمیت

محمد نذیر(3rd year)

موجودہ دور میں امت مسلمہ جدیدیت(Modernism) کے نام پر حضور ﷺ کی سنن کو چھوڑتی جارہی ہے بالخصوص وہ سنتیں جو امت مسلمہ کو دیگر اقوام سے ممتاز کرتی ہیں۔ان میں سے ایک سلام کرنا بھی ہے۔کیونکہ سلام ایک کافر اور مسلمان میں فرق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور یہ امت مسلمہ کا شعار بھی ہے۔زمانہ جیسے جیسے ترقی کررہاہے ویسے ویسے سلام کرنے کی اسلامی اقدار میں کمی آتی جارہی ہے۔ایک دور وہ بھی تھاجب شروع ہی سے مائیں چھوٹے معصوم بچوں کو سلام کرنے کی طرف مائل کرتی تھیں اور ابتداء میں یہ طریقہ اپناتی تھیں کہ بچہ سلام کرنے کے لئے اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا دیتا تھا، اس طرح رفتہ رفتہ بچہ گھر والوں کو خود سلام کرنے کا عادی ہوجاتا۔دیکھنے والوں کو بھی خوشی ہوتی، جس کو سلام کیاجاتا وہ بچے سے پیار کرتا، دل سے اس کے لئے دعائیں بھی نکلتی تھیں۔جوں جوں بچہ بڑا ہوتا جاتا خود ہی اسلامی اصولوں کے مطابق صحیح سلام کرنے کا طریقہ بھی سیکھ جاتا تھا۔یہاں تک کہ لوگ رات کو سونے سے قبل ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے جب صبح سو کر اٹھتے تو اہل خانہ ایک دوسرے کو سلام کرتے۔جس سے اللہ کی رحمتیں نازل ہوتیں اور گھر کا ماحول خوشگوار رہتا اس کے ساتھ ساتھ آپس میں محبتیں بڑھتیں اور امن و سلامتی بھی نصیب ہوتی تھی۔

انفرادی اوراجتماعی سطح پر بچوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق مناسب اور صحیح وقت پر تربیت نہ ملنے کی وجہ سے ہمارا معاشرہ بگڑتا جارہاہے۔اب حال یہ ہے کہ گھروں کے اندر بالخصوص اور باہر بالعموم ایک دوسرے کو سلام کرنے کی سنت کو دن بدن چھوڑا جارہاہے۔مثلاً کسی کو دیکھ کر حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ آمنا سامنا نہ ہو دور ہی سے سلام کے انداز میں ہاتھ ہلا دیاجائے اور اگر آمنا سامنا ہو بھی جائے تو مغربی طریقہ کے مطابق ہیلو ہائے کرلیاجاتا ہے اور رخصت ہوتے وقت سلام یا خدا حافظ کے بجائے بائے بائے اور ٹاٹا کے الفاظ کہہ کر دل کو تسلی دے دی جاتی ہے کہ سلام ہوگیا۔جو کہ ہرگز اسلامی طریقہ نہیں۔

سلام کا مقصد و مطلب:

اسلام میں سلام کا مقصد محض کسی شخص کی تعظیم تکریم ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے دل سے نکلنے والی دعاؤں کا اظہار بھی ہے۔لہذا جب کسی مسلمان بھائی کی دوسرے مسلمان بھائی سے ملاقات ہو تو اس سے اپنے تعلق، محبت، مودت کا اظہار کرنے کے لئے "السلام علیکم" کہے۔

یہ قرآنی تعلیم اور سنت نبوی ﷺ ہے۔سلام کرنا سنت ہے اور سلام کا جواب دیناواجب ہے۔"السلام علیکم" کے معنیٰ ہیں تم پر (اللہ کی) سلامتی ہو۔صرف یہ دو ہلکے پھلکے کلمات زبان

سے ادا کر کے ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے امن و سلامتی چاہتا ہوں یعنی سلام کرنے سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ آپ کی جان مال عزت آبرو مجھ سے محفوظ ہیں، دوسرا مسلمان بھائی وعلیکم السلام کہہ کر اسی بات کا اعادہ کرتا ہے۔ دن میں جتنی بار ملاقات ہو ہر بار سلام کرنا سنت نبوی ﷺ ہے۔ حتی کہ اسلام میں سلامتی اور امن و امان کا تصور اتنا اہم ہے کہ لفظ "سلام" قرآن مجید میں 40 سے زائد مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

اور حدیث مبارکہ کے مطابق جب کوئی شخص تمہیں السلام علیکم کہے تو تمہارا جواب وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ ہونا چاہئے۔ اور جب کوئی شخص تمہیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے تو تمہارا جواب وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہونا چاہئے۔ یہ سلام کا احسن اور بہترین طریقہ ہے۔ السلام علیکم کم از کم جواب وعلیکم السلام بھی ہو سکتا ہے جس پر دس نیکیوں کا اجر و ثواب ملتا ہے جب کہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے اضافے سے 20 اور 30 نیکیوں کا اجر و ثواب ملتا ہے۔ (ابو داؤد)

سلام سے متعلق قرآن مجید کی چند آیات:

1۔ اور جب تمہیں کوئی کسی لفظ سے سلام کرے تو تم اس سے بہتر لفظ میں کہو یا وہی کہہ دو بے شک اللہ ہر چیز پر حساب لینے والا ہے۔ (کنز الایمان، النساء: 86)

2۔ اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں نہ جاؤ جب تک اجازت نہ لے لو اور ان کے ساکنوں پر سلام نہ کر لو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم دھیان کرو۔ (کنز الایمان، النور: 27)

3۔ پھر جب کسی گھر میں جاؤ تو اپنوں کو سلام کرو ملتے وقت کی یہ اچھی دعا اللہ کے پاس سے مبارک پاکیزہ ہے۔ (کنز الایمان، النور: 61)

سلام سے متعلق چند احادیث:

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ اسلام کا بہترین عمل کون سا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا بھوکوں کو کھانا کھلانا، واقف اور ناواقف ہر ایک کو سلام کرنا۔ (بخاری و مسلم)

2۔ تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہیں بن جاتے اور تم اس وقت مومن نہیں بن سکتے جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرنے لگو۔ کیا میں تمہیں ایک ایسا طریقہ نہ بتادوں کہ جس کو اختیار کر کے تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے۔ آپس میں سلام کو عام کرو۔ (مشکوۃ، مسلم)

3۔ جب تم گھر میں داخل ہوا کرو تو گھر والوں کو سلام کیا کرو اور جب تم گھر سے باہر جانے لگو تو سلام کر کے رخصت حاصل کیا کرو۔

4۔ حضور علیہ السلام جب بچوں کے پاس سے گزرتے تو ان کو بھی سلام کرتے سلام کر کے گھر میں داخل ہوتے اور ازواج مطہرات کو بھی سلام کرتے۔ (بخاری و مسلم)

سلام سے متعلق کئی ایک قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ ملتی ہیں۔ ہم نے صفحات کے دامن کی گنجائش کو دیکھتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہے۔ افضلیت اسی میں ہے کہ سلام میں پہل کی جائے چاہے مخاطب چھوٹا ہو یا بڑا۔ سلام میں پہل کرنے والا زیادہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام بچوں کو سلام کرنے میں بھی پہل کیا کرتے تھے۔ جب ہاتھ ملایا جائے تو اس

وقت تک نہیں چھڑوانا چاہئے جب تک ملانے والا خود نہ چھوڑے۔(یہی سنت بھی ہے)۔

آج کل ہمارے معاشرے میں مروج ہے کہ کسی سے کہہ دیا کہ فلاں کو سلام کہہ دینا تو وہ فوراً سے وعلیکم السلام کہہ دیتا ہے۔ جو کہ درست نہیں ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ کو سلام پہنچانے کی جو امانت سونپی جارہی ہے اگر آپ اس کی ادائیگی پر قدرت رکھتے ہیں تو آپ اس امانت کے متحمل بنیں ورنہ معذرت کرلیں۔ سلام قبول کرلینے پر اس کا پہنچانا واجب ہو جائیگا۔ سلام پہنچادیں گے تو ثواب ملے گا ورنہ واجب کی غیر ادائیگی پر گناہ ہو گا۔ اور اگر آپ کو سلام لانے والا سلام پہنچائے تو اس کے جواب میں "وعلیک وعلیہ السلام" (تجھ پر اس پر سلامتی ہو) کہنا چاہئے۔

سلام کے آداب:

1۔ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی سے ملے تو بات شروع کرنے سے پہلے سلام کرے۔

2۔چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔

3۔سوار پیدل کو سلام کرے۔

4۔چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔

5۔سلام کا جواب کم از کم اتنی بلند آواز سے دیا جائے کہ سلام کرنے والا سن لے۔

6۔مخاطب فاصلے پر ہو تو اشارے سے سلام کیا جاسکتا ہے(لیکن زبان سے بھی سلام کے الفاظ ادا کئے جائیں صرف اشارہ کافی نہیں)

7۔اہل کتاب کے سلام کے جواب میں صرف "علیک" یا "وعلیک" کہے۔

8۔غیر مسلم کے سلام کے جواب میں وعلیکم کہہ دینا چاہئے۔

ایک غور طلب بات:

آپ کن الفاظ سے سلام کہتے ہیں؟

1۔ السلام علیکم(تم پر اللہ کی سلامتی ہو)

2۔ السام علیکم(تم کو موت آئے)

3۔ سام علیکم(تم برباد ہو جاؤ)

4۔ سلائے کم۔(تم پر لعنت ہو)

5۔ اسائے کم(تم خوشی کو ترسو)

سلام کی تشہیر بھی تبلیغ اسلام کے حکم میں داخل ہے۔ تاجدار کائنات کا یہ فرمان مبارک ہے"افشوا السلام"(سلام کو پھیلاؤ)ہم سب کو چاہئے کہ سلام کے تمام تقاضوں کو بجالاتے ہوئے سلام کی تشہیر کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔

اقوال زریں

(1)حرص سے آدمی کی روزی نہیں بڑھتی بلکہ قدر گھٹ جاتی ہے،(2)غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو،(3)شکر نعمت حصول نعمت کا باعث ہے،(4)علم وہ دولت ہے جسے کوئی چوری نہیں کر سکتا،(5)عمل وہ راستہ ہے جو منزل تک لے جاتا ہے،(6)ہر شخص کسی نہ کسی فن کا عالم ہوتا ہے،(7)نیت صاف منزل آسان۔ مراسلہ:۔عبد الغفار 4th year

رواداری کا مفہوم (سیرتِ طیبہ کی روشنی میں)

محمد فیاض

زمانے کی مادی ترقی، علمی وفنی عروج اور علماء کی نئی نئی تحقیقات کے باوجود یہ بات ماننے کے بغیر چارہ نہیں کہ جس چیز کو جانِ دوعالم ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے خوب قرار دیا اسے آج تک ناخوب ثابت نہ کیا جاسکا اور جسے آپؐ نے ناخوب گردانا اسے اب تک خوب قرار نہ دیا جاسکا۔

زمانے میں انقلاب آتے رہتے ہیں، کبھی تاریکیاں پھیلتی ہیں تو کبھی روشنیاں پھوٹتی ہیں، حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، تمدنی اور مذہبی حالات بے حد خراب تھے۔ سارے عالم کے لئے حضور اکرمؐ کی بعثت اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ دنیا کے عام حالات اچھے نہ تھے اور ایک عالم گیر مصلح کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ برائی، جب محدود ہوتی ہے تو اسی محدود علاقے کے لئے مصلح کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب وہ عام ہوجائے تو پھر ایسے مصلح کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کے پاس سارے عالم کے دردوں کا مداوا ہو۔ حضور اکرم ﷺ دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ہادی ورہبر بن کر تشریف لائے۔ چین اپنے مذہبی رہنما کنفیوشس کے زیرِاثر پھلا پھولا وہاں بہت سے نشیب وفراز آتے گئے۔ بعثت نبوی ﷺ سے قبل وہاں کے حالات بھی دگرگوں ہوگئے اور ترقی کی راہیں مسدود ہوگئیں، ہزاروں سال قبل مسیح ہندوستان میں آریہ قبائل آئے جن کے زیرِ اثر ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم، دیوتاؤں کی پرستش اور ترکِ دنیا وغیرہ کے نظریات اجتماعی زندگی کے قابل نہیں رہے تھے۔ خود غرضی کے سوا انسانیت کی خدمت اور حقوق کے لئے کوئی بلند نظریہ نہ تھا۔ یونان تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ یورپ میں روسی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ مگر یہ مغربی اور مشرقی دو حصوں میں بٹ گئی تو مغربی روسیوں پر جرمنی وغیرہ کے وحشی قبائل ٹوٹ پڑے اور پایہ تخت روما کے مالک بن گئے۔ الغرض! اس زمانے میں جدھر دیکھئے دنیا میں تباہی اور فتنہ وفساد ہی نظر آتا ہے ہر علاقہ اپنے غم میں مبتلا تھا۔ دوسرے کے غم میں کیسے شریک ہوتا! حضور اکرم ﷺ نے پوری انسانیت اور انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لئے واضح رہنمائی مہیا فرمائی ہے آپؐ کی پیش کردہ ہدایات وتعلیمات زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں۔ میں آپ کے سامنے سرورِ دوعالمؐ کی رواداری اور احترامِ انسانیت کی چند جھلکیاں پیش کرتا ہوں کہ جو معاشرے میں پیدا ہونے والے امراض کے لئے دوائے کامل کا درجہ رکھتی ہیں۔ رواداری کا میدان بہت وسیع ہے جس کا ایک اہم باب اچھا "شہری" ہونا ہے کیونکہ شہری ہونا بھی انسانی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آنحضرتؐ نے آج سے چودہ سو سال پہلے قولی اور عملی طور پر ایک اچھے شہری کے اوصاف اس کے حقوق اور شہریت کی اعلیٰ قدروں کو پوری

وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش فرمایا ۔ ایک شہری کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھے تو اظہارِ ہمدردی کرے ،کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے بیماروں کی عیادت کرنا حضورؐ کے معمولات میں سے تھا۔ دوست، دشمن، مومن و کافر کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا۔سب کی عیادت فرماتے ۔ اس سے بڑھ کر حقوق انسانیت کے لئے عملی صورت کوئی اور نہیں ہوسکتی۔الغرض کہ زمانے کی مادی ترقی، علمی و فنی عروج اور علماء کی نئ نئ تحقیقات کے باوجود یہ بات ماننے کے بغیر چارہ نہیں کہ جس چیز کو جانِ دوعالمؐ نے آج سے چودہ سوسال پہلے خوب قرار دیا اسے آج تک ناخوب ثابت نہ کیا جاسکا اور جسے آپؐ نے ناخوب گردانا اسے خوب قرار نہ دیا جاسکا۔اسلام نے اپنے ماننے والوں کو احترام آدمیت کا جو سبق پڑھایا ہے وہ اس وقت کے انسانی ہمدردی کے علمبرداروں کی سوچ سے بھی میلوں دور ہے ۔سرکارِ دوعالمؐ کی نگاہ بلند میں شرافت و انسانیت کا یہ تصور تھا جس نے انسانیت کو بہت محترم کر دیا تھا، حالت جنگ میں ، عقل و دانائی کے اس دور میں بھی ،شرافت اور انسانیت کا دامن تار تار ہوتا نظر آتا ہے مگر جانِ دوعالمؐ نے اس حالت میں بھی احترامِ انسانیت کا وہ درس دیا جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ملازمین کے ساتھ حسن رواداری بھی سیرت طیبہ کی روشنی سے عیاں ہے اور اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ ملازم کو اس کی ملازمت کا تحفظ حاصل ہو، حضور اکرمؐ نے تمام عمر کسی ایک خادم کو بھی خدمت سے الگ نہیں کیا۔ آپؐ خدام کی غلطیاں معاف فرمادیتے اور ان کی کوتاہیوں کو نظر انداز فرمادیتے۔ عموماً فی زمانہ ملازمین بے چارے اپنے حقوق کے لئے دربدر دھکے کھاتے نظر آتے ہیں کہ جن حقوق کو رسول اللہؐ نے پہلے ہی متعین فرمادیا تھا۔وقت پر تنخواہ نہ ملنا کئی کئی ماہ کی تنخواہ کی عدم ادائیگی کے لئے احتجاج کی آوازیں بلند ہوناسنائیں دیتی ہیں، حالانکہ رسول اللہؐ کا واضح ارشاد موجود ہے کہ "مزدور کو مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو"۔ یہ مالکان ،ذمہ داران اور اہل حل وعقد کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔اور دوسرا سب سے بڑا استحصال یہ ہے کہ بنا کسی وجہ کے ملازم کو نوکری سے برطرف کر دیا جاتا ہے یہ شرعاًاور اخلاقاً بلکہ قانوناًجرم ہے۔ ہمارا معاشرہ اور ہمارے ملازمین ان جیسے ان گنت مسائل کا شکار ہے ۔ جبکہ ان کے ساتھ بہتر رواداری کا سلوک اور حقوق طے شدہ ہیں۔ ہمارے معاشرے کے تاجر انہی مزدورں کے خون پسینے سے پیسہ نکال کر انہی کو ان کے حق کے لئے اذیتیں دیتے ہیں اور کچھ کو تو غلام کی حیثیت بھی نہیں دیتے شاید اسی دور کے لئے کہا گیا تھا کہ:

؎روپیہ کرے راج اور بندہ بن جائے غلام

ایسی تہذیب تو تہذیب کی رسوائی ہے صد حیف ! کہ ہمارے ملک میں مزدور ڈے منا کر عالمی سطح پر یہ پیغام تو دے دیا جاتا ہے کہ ہم ملازمین اور مزدوروں کے خیر خواہ ہیں لیکن عملی اقدام میں شاید ہم نے کچھ بھی دستور نہیں بنایا۔ ہر روز کی طرح یوم مزدور کو ایک محنت کش کام کرتا ہے اور پہلے سے آرام کرنے والے اے، سی رومز میں بیٹھنے والے گھروں میں آرام کرتے ہیں اور ہم مزدور ڈے ٹی،وی تھیٹر، ٹاک شوز جیسے

آرام دہ جگہوں میں منا کر کس پر احسان کر رہے ہیں ؟؟؟ اور اس پر مستزادیہ کہ جانوروں کے ساتھ بھی حسنِ رواداری کا درس دیا گیا ہے ۔رسول اکرمؐ نے حیوانات کے حقوق کی نگہداشت کی بہت تاکید فرمائی ہے اور ان پر ظلم وزیادتی سے سختی سے منع فرمایا ہے، کسی جانور کو بلاوجہ اذیت دینا اور قتل کرنا بھی گناہ قرار دیا ہے ۔حتیٰ کہ فرمایا کہ جانور کو ذبح کرنے والا اپنی چھری کو خوب تیز کرلے تاکہ جانور کو بلاوجہ تکلیف نہ ہو۔ حیوانات سے انسان اپنی ضروریات زندگی کی بہت سی چیزیں حاصل کرتے ہیں عدل وانصاف کا یہ تقاضہ ہے کہ جن حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے تابع بنایا ہے اور اس کے رحم وکرم پر چھوڑا ہے ان کے خوردونوش اور آرام کا خیال رکھے۔یہ انسانیت کے اعلیٰ مناصب سے گری ہوئی بات ہوگی کہ انسان خود غرضی سے کام لیتے ہوئے ان سے محض اپنی مقصد بر آری کرتا پھرے اور ان کی خاطر خواہ دیکھ بھال نہ کرے۔ آپؐ نے جانوروں کو باہم لڑانے سے منع فرمایا۔ایک دفعہ ایک لاغر اونٹ کی حالتِ زار دیکھ کر اس کے مالک کو تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ:"ان بے زبان جانوروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، درست حالت میں ہی ان پر سواری کرو اور درست حالت میں ہوں تو ان کو چھوڑو"

ایک دفعہ کسی شخص نے ایک چڑیا کے انڈے اٹھالیے، چڑیا بے تابی سے اپنے آپ کو زمین پر رگڑنے لگی، آپؐ نے دیکھ کر فرمایا کہ:

"انڈے وہیں رکھ دو جہاں سے اٹھائے ہیں"۔

سرکار دوعالم ﷺ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا جو فاسق وفاجر تھا اس نے ایک پیاسے کتے پر رحم کھاکر اسے پانی پلایا، اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔اس کے مقابلے میں ایک خاتون کا ذکر کیا گیا جس نے ایک بلی کو باندھ دیا تھا، نہ اسے کھانے پینے کے لئے کچھ دیا اور نہ ہی اسے چھوڑا کہ وہ خود اپنی خوراک تلاش کرتی، چنانچہ وہ بلی بھوکی پیاسی مرگئی۔اس ظلم کی بنا پر وہ خاتون عذاب میں مبتلا کردی گئی۔اس سے اندازہ لگانا چاہیے کہ جس مذہب کی تعلیمات اتنی مشفقانہ ہوں اور جس قوم کے پیغمبر کی رواداری کا عالم یہ ہو کہ سڑک کنارے ایک جانور کے بچوں کو ماں کا دودھ پیتے دیکھ کر پورے قافلے کو رک جانے کا حکم دے دے (صرف اسلئے کہ وہ اپنی بھوک ادھوری چھوڑ کر نہ بھاگ جائیں)اس کے ماننے والے خود غرض، انتہاپسند، متشدد اور دہشت گرد کیسے ہوسکتے ہیں؟

ظلم کی ایک قسم

کیا یہ بھی ظلم کی ایک قسم نہیں کہ کسی سے غوروفکر کا موقع ھی چھین لیا جائے؟ کیا وہ شخص ظالم نہیں جو کسی کی توجہ ایک اصلاحی سوال سے کسی طرح پھیر کر اسے براہ راست خود سننے, سمجھنے, سوچنے, جواب دینے اور غلط طرز عمل بدلنے کے نتیجہ خیز لمحہ, ساز گار ماحول اور پنپتی صلاحیت سے ھی محروم کردے؟ (لمحات فکر(1):از جسٹس رشید گل صاحب)

دین ابراہیمی علیہ السلام

نادعلی (2nd year)

یہ داستانِ عروج وزوال' تخلیق کائنات یعنی ابتدائے آفرینش سے لے کر حیات بشر تک آتی ہے .پھر اشرف المخلوقات کے اعزاز سے مستفید ہونے سے لے کر حیات انسانی میں پائی گئی نشانیوں کو' اس داستانِ عروج وزوال کو بارہاں کلام پاک میں دہرایا جاتا ہے.. مگر کس لیے؟ لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر ہوتی یہ داستان تخلیق کچھ مزید پیچیدہ دکھائی دیتی ہے جیسے کہ کسی ٹیالن کے گہرے گھنے بال کہ جب انکی میڈھیاں بنائی جاتی ہیں تو سانس کچھ پل رکتی نظر آتی ہے... اشرف المخلوقات کو جو کہ اپنی پیدائش پہ نازاں نظر آتی ہے اسے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ (هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ) ھل استفہامیہ کے ساتھ جھنجوڑ کر یہ بات پوچھی جاتی ہیکہ کیا انسان پر وہ وقت وہ زمانہ نہیں گزرا؟ (لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا) کہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا. پھر آخر ایسی کیا تغیر پزیری ہوئی حیات انسانی میں کہ وہ اپنے خالق یعنی مالک کن فیکون کا ہی انکار کر بیٹھا اور ظلم وبربریت کے وہ بازار گرم کیے کہ انسانیت سسکتی بلبلاتی اور پھر دم توڑتی نظر آئی. بازارِ نمائش حسن سے لے کر بازارِ قتل وغارت تک اس انسان نے (جو صدیوں پہ محیط زمانے میں کوئی قابل ذکر شے نہ تھا) ایک لمحے کیلئے بھی اس بازارِ نمود ونمائش کو سرد نہ پڑنے دیا.. اس داستان بے کراں میں عقل کو کبھی تو بیڑیاں ڈال کر زندان کی سیر کرائی گئی تو کبھی یونان میں سقراط کے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینے پہ مجبور کیا گیا۔ لاشعور سے شعور کا یہ سفر اس قدر اذیت ناک ہے کہ حیات انسانی خود ہی بلبلا اٹھتی ہے، شعور انسانی کو کبھی تو بیچ بازار میں گھنگروڈال کے نچوایا گیا تو کبھی پیروں تلے روندا گیا... مگر کیا انسان نے پیدا ہونا چھوڑ دیا؟ یا عقل وشعور کو پابندِ سلاسل کرنے کے بعد عقل نے جنم نہ لیا؟ اگر ایسا نہیں تھا تو کوئی ایسا ذی حیات پیدا کیوں نہیں ہوا جو عقل کی بنیاد پہ سچ اور جھوٹ کی پرکھ کر سکے ؟ کسی عقل نے کسی متجسس روح نے کسی خود شناس نے اس صنم خانے میں خدا کی ذات کو تلاش کیوں نہیں کیا؟ کوئی ایک شخص جس نے اپنی اور حیات انسانی کی ترجیح اول کو اس مسافر کی طرح ڈھونڈا جو صحرائے گوبی میں زندگی کی تلاش میں مارامارا پھرتا ہے یا پھر کسی عقل نے توحید کی مئے غوروفکر سے چکھی ہو؟

یہ وہ سوالات ہیں جو مذہب پر بصورت الزام دھرے جاتے ہیں اور مذہب کو blind faith تصور کیا جاتا ہے مگر سوچنے کی بات ہے کہ کیا ایسا ہی ہے ؟ تقریباً 2ہزار تین سو سال قبل از مسیح، ابراہیم بن تارخ بن ناخور نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ دور اپنے آباء واجداد کے عقیدوں کی بقا کا دور تھا ہر شخص نے اپنا خدا بصورت بت خود تخلیق کیا ہوا تھا، یہاں تک کے ابراہیم علیہ السلام جس خاندان میں پروان چڑھے وہ خاندان بذات خود بت فروش تھا.. ابراہیم نے اپنے اردگرد بت فروشی سے لے کر بت پرستی تک کو دیکھا مگر ایک دفعہ بھی کسی بت کے آگے نہیں جھکے.. اسلام کو blind faith کہنے والے یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ نوعمر ابراہیم اپنے بت فروش چچا کو یہ کہتے ہیں کہ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا

يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِي عَنكَ شَيۡـًٔا..

آپ کیوں معبود بناتے ہیں انکو جو نہ تو سنتے ہیں اور نہ ہی دیکھتے ہیں اور نہ ہی آپکی کوئی مدد کرتے ہیں.. ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم سے بھی یہی مطالبہ کرتے ہیں اور دلائل کی بنیاد پہ غور و فکر سے کام لیتے ہوئے انکی بت پرستی کو رد کرتے ہیں۔ اُس قوم میں صرف بت پرست ہی نہیں پائے جاتے ہیں بلکہ ایک کثیر تعداد ستارہ پرست، چاند کو خدا ماننے والوں اور آگ برساتے سورج کو سجدہ کرنے والوں کی ہے. ابراہیم علیہ السلام کے پاس وہ لوگ بھی آتے ہیں اور اپنے مذہب کی دعوت دیتے ہیں ابراہیم مشاہدہ کرتے ہیں ستاروں اور چاند کا، غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں بے شک میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا پھر سورج کی طرف نگاہِ التفات کرتے ہیں، شام تک کا مشاہدہ جب سورج کو ڈوبتا ہوا دکھاتا ہے تو پکار اٹھتے ہیں کہ میں بیزار ہوں تمہارے ان خداؤں سے... پھر نوبت بت شکنی تک پہنچتی ہے مگر وہ بھی انداز ناصحانہ دینے میں بڑے بت کے علاوہ سبھی کو توڑتے ہیں اور قوم جب اپنے خداؤں کی حالت دیکھتی ہے تو ابراہیم سے پوچھتی ہے، تو کس قدر تفکر میں ڈوبا ہوا جملہ ادا کرتے ہیں کہ پوچھو اپنے بڑے سے اسی نے توڑا ہو گا... قوم اپنے منہ سے خود کہتی ہے ابراہیم..! یہ تو بولنے والے نہیں بھلا یہ کہاں بتائیں گے ؟ ابراہیم کہتے ہیں تو کیا تم انکی عبادت کرتے ہو جو اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے ؟ اسلام کو blind faith کہنے والوں سے یہ سوال کرنا مناسب ہو گا کہ کیا آپ نے کبھی اپنے حریف سے اسکی شکست کا اعتراف اسی کی زبان سے کروایا؟ کیا ابراہیم کی یہ باتیں صرف جذبات ہیں، محبوبانہ عقل کے سامنے ؟ کیا یہ باتیں تفکر و تدبر پہ مبنی نہیں ہیں ؟ یا پھر ناقدین اسلام بھی ایک اندھی تقلید میں پڑے ہیں جو ابراہیم کا نہیں ابراہیم کی قوم کا وطیرہ ہے۔

ہم پھر آگے دیکھتے ہیں ابراہیم علیہ السلام کو دربارِ جاہ و جلال میں اُس نمرود کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جو جبر و قہر کا منبع نظر آتا ہے اور اپنے زعم میں خود ہی خدا بنا بیٹھا ہے تمام درباری سر جھکائے کھڑے ہیں دل دھک دھک کرنا بھول جاتے ہیں کہ جب عقیدوں کے پیمانے ٹوٹتے ہیں تو انسان پہلے ہی مر چکا ہوتا ہے۔ مناظرہ شروع ہوتا ہے نمرود ابراہیم علیہ السلام سے سوال کرتا ہے کون ہے تمہارا رب ؟(قال ابراهيم ربي الذی يحيي و يميت)ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے ،اجسام میں موت و حیات کو پیدا کرتا ہے، ایک بے جان نطفے سے ایک رقیق سیال بدبودار مادے سے عدم سے وجود میں لاتا ہے، لا سے الا کرتا ہے نیست سے ہست میں بدلتا ہے.. قال انا احی و امیت.. نمرود نے کہا میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں. پھر بطور دلیل دو شخصوں کو بلاتا ہے ان میں سے جسے آزادی کا پروانہ تھمایا جا چکا تھا اسے قتل کرتا ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیتا ہے.. عقلمندوں پر ظاہر ہو چکا تھا کہ جواب ممکن نہیں مگر نمرود احمقانہ دلیل پیش کرتے ہوئے خود کو بچانے کی سعی کرتا ہے.. ابراہیم بولے اچھا! بے شک میرا اللہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے آپ اسکو مغرب سے لے آیئے.. (فبهت الذی کفر..) کافر مبہوت ہو کہ رہ جاتا ہے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ آپ بس ایک لمحے کیلئے خود کو دربارِ نمرود میں تصور کیجئے اور دل پہ ہاتھ رکھ کے بتایئے کہ ابراہیم کے

دلائل ابراہیم کا دین اندھوں کا دین ہے ؟ کیا ابراہیم کا دین بغیر سوچے سمجھے مفروضے قائم کرنے اور پھر ان پر ایمان لانے کا دین ہے ؟ آپ کی شکست خوردہ نظر واپس لوٹ آئے گی مگر نشانیاں تو سوچنے والوں کے لیے ہیں.. اس ذی حیات کے لیے ہیں جو دی گئی عقل کو استعمال کرتا ہے سوچتا ہے سمجھتا ہے... نیٹشے کا یہ قول سنانے والے

("If u wish to strive for peace of soul and happiness, Then Believe, If u wish to to be disciple of truth, Then inquire")

ہمیں blind faith کا طعنہ دیتے ہیں مگر مصیبت در مصیبت یہ ہے کہ قرآن اٹھا کر نہیں دیکھتے قرآن کیا کہتا ہے (ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلاً) اور وہ جو زمین و آسمان کی خلقت کے رازوں کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے پالنے والے تو نے انھیں بیکار خلق نہیں کیا ہے۔ قرآن بھی تو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے تفکر و تدبر پہ آمادہ کرتا ہے اوندھے منہ آیتوں پہ پڑنے والوں کو چوپایوں سے بدتر کہتا ہے.. مگر یہ کہ اسے کوئی کھولے تو سہی سمجھے تو سہی یہاں تک تو تھا غیروں کا مسئلہ اور غیروں کی باتیں ..! مگر اس سب میں امت مسلمہ کا زوال کیوں ہے اور مسئلہ کیا ہے ؟ مسئلہ بقول علامہ اقبال یہ ہے کہ

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

اور بقول پروفیسر احمد رفیق، عقل جہاں رکتی ہے وہاں بت خانہ تخلیق کرتی ہے ہم نے اس تحفہ خداوندی عقل و شعور کو پس پشت ڈالا، ہم نے اپنے زعم میں فرقہ پرستی سے لے کر شخصیت پرستی تک چھوٹے چھوٹے بت خانے تخلیق کیے اور پھر اسی پہ ڈٹ گئے... واعظ نے ہمیں معجزوں اور تقدس کی دنیا میں گھمانے پہ اکتفا کیا تخیل و اعناب کے قصے اور حوروں کی جلوہ گری ہی دکھائی بس 'فرقوں میں بانٹا اور خود مسند تقدس پہ براجمان ہو گئے اور ہم نے سہمے ہوئے یہ سب قبول کر لیا.. مگر کیا ابراہیم علیہ السلام کا دین صرف معجزوں کا دین تھا؟

ابراہیم علیہ السلام کا دین تو غور و فکر کا دین تھا سوچ و بچار کر کے فیصلہ کرنے کا دین تھا اور تحقیق کا دین تھا تفکر و تدبر کا دین تھا اپنے اعتقاد کو مضبوط دلائل پہ قائم کرنے والوں کا دین تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کا دین آیتوں پر اوندھے منہ پڑنے والوں کا دین نہی تھا blind faith والوں کا دین نہی تھا، چمتکار و فریب روز گار کا دین نہی تھا ابراہیم کا دین اسلام تھا صرف اسلام.. مگر ہم نے کیا ظلم کیا اپنی جانوں پہ آج ہمارا دین کیا ہے.. ؟ آج ہمارا دین سنی ہے شیعہ ہے وہابی ہے دیوبندی ہے اہل حدیث ہے نہیں ہے تو آج ہمارا دین اسلام نہی ہے.. قسم باخدا...! یہ زوال ختم نہیں ہونا یہاں تک کہ فرقوں سے آگے نکل کر ہم دین ابراہیمی پہ اپنی دلیلوں کو استوار نہ کر لیں عقل و شعور کا ادراک نہ کر کے اسے جانچ نہ لیں اور غور و فکر کو right path پہ گامزن نہ کر لیں ہم جس دن اسلام کی اصل کو لوٹے، وہ امت مسلمہ کے زوال کا آخری دن ہو گا.....

اپنے من میں ڈوب کے پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ، اپنا تو بن

انسان کا ارتقاء قرآن کی نظر میں

فدا احمد (3rd year)

قرآن مجید فرقان حمید کتاب فطرت ہے ۔ قرآن مجید میں خالق کائنات نے آسمان کی رفعتوں سے لے کر زمین کی تہہ در تہہ تک کا ذکر فرمایا ہے۔ اس لاریب کتاب میں خالق ارض و سماء نے ذرے سے لے کر بلند و بالا پہاڑوں کی پیدائش کا بھی ذکر فرمایا ہے ۔ اسی تبیانا لکل شیء والی کتاب میں اللہ تعالیٰ نے ایک مخلوق کا ذکر خاص طور پر فرمایا ہے اور وہ مخلوق تمام مخلوقات پر سبقت رکھتی ہے۔ اس مخلوق کا نام انسان ہے، اسی انسان کو خالق کائنات نے مسجود ملائکہ اور سرداری کا شرف بخشا ہے۔ اور خلیفۃ اللہ کے منفرد لقب سے انسان کو یاد فرمایا ہے۔

ہر کتاب کا ایک مضمون ہوتا ہے اور قرآن کا مضمون انسان ہے۔ اس کلام پاک میں اللہ رب العزت نے خاص طور پر انسانوں سے کلام فرمایا ہے اور یہ نازل بھی انسان پر ہوا ہے۔ قرآن مجید میں جابجا بالعموم اور پہلی وحی میں بالخصوص انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل اور موت تک کا بھی ذکر ہے۔

انسان کی تخلیق اور اس کا ماں کے پیٹ میں بہت تاریک پردوں میں رہ کر تخلیق کے مراحل سے گزرنا اللہ عزوجل کی قدرت کی عظیم نشانی اور بہترین شاہکار ہے۔ ہر مخلوق کی تخلیق خالق کائنات کی ہے مگر جس انداز سے انسانی تخلیق اور حقیقت کا ذکر فرمایا ہے دوسری مخلوقات اس انداز سے محروم ہیں۔

اللہ عزوجل نے حضرت آدم علیہ السلام سے نسل انسانی کا سلسلہ شروع فرمایا اورآدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ آقا کریم علیہ السلام نے فرمایا: "آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔" اس پیدائش کا اللہ عزوجل نے قرآن پاک میں مختلف انداز میں بیان فرمایا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے

"وہی تو ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔" (غافر:67)

پھر فرمایا: "گیلی مٹی سے" (الانعام)

یہ پانی اور مٹی کا امتزاج ہے۔

آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد خالق کائنات نے عزت و شرف کا تاج آپ کے سر پر سجایا، مسجود ملائکہ بنایا۔ پھر خلیفۃ اللہ کی ذمہ داریوں کے بوجھ کے ساتھ زمین پر متمکن فرمایا یہاں سے نسل انسانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے:

پھر اس کی نسل حقیر پانی کے نچوڑ سے پیدا کی۔ (السجدۃ:8)

انسان کی پیدائش میں مرد اور عورت کا بڑا کردار ہے۔ اللہ عزوجل اس پر بھی قادر ہے کہ بغیر ملاپ کے بھی پیدا کر سکتا ہے۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اور یہ کہ اسی نے جوڑا نر اور مادہ پیدا کیا ہے۔ (الحج:45)

جب مرد اور عورت آپس میں مباشرت کرتے ہیں تو دونوں کی رطوبتیں آپس میں مل جاتی ہیں اورانسان کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے: "ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔" (الدھر:2)

یہ نطفہ کہاں جمع ہوتا ہے: قرآن فرماتا ہے: "پھر اس کو ایک

مضبوط اور محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر قرار دیا"(المومنون:13)
یہاں سے ایک اور مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی نطفہ پھر خون کا ایک لوتھڑا بننا شروع ہو جاتا ہے پھر خون سے گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گوشت کے بعد ہڈیاں بنتی ہیں۔ ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھایا جاتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے:
"پھر وہ لہو کا لوتھڑا ہوا پھر اللہ نے اس کو بنایا پھر (اس کے اعضاء) کو درست کیا"(القیامۃ:38)
تقریباً 9 مہینے کے بعد انسان شکم مادر سے پیدا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی عمر بڑھنے لگتی ہے۔ بچپن، لڑکپن اور جوانی کی دہلیز پر بھی قدم رکھتا ہے۔ اسی جوانی میں انسان ایک اکمل جسمانی ساخت میں ہوتا ہے۔ اس کے جسم میں گرم خون اور بازوؤں میں فولادی طاقت ہوتی ہے۔ اس کے اندر غرور و تکبر آ جاتا ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ ہوا جتنی بھی تیز ہو پہاڑوں میں سوراخ نہیں کر سکتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان ایک فرمانبردار بندہ بن جاتا ہے۔ یا سرکشی پر اتر آتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے:"اے انسان تجھ کو اپنے کریم رب سے کس چیز نے بھٹکایا۔"(الانفطار:6)
جوانی کی دہلیز پار کرنے کے بعد انسان بوڑھا بھی ہو جاتا ہے۔ اسے بڑھاپے کی بادشاہی مل جاتی ہے۔ بڑھاپے کی حالت میں انسان دیوانگی کے عالم میں اپنے آپ پر ہنستا اور افسوس کرتا ہے۔ ندامت سے پیشانی پر بل آتے ہیں۔ بڑھاپے میں انسان کی وہ جسمانی ساخت باقی نہیں رہتی۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے:
"اور جس کو ہم بوڑھا کرتے ہیں تو اسے پیدائشی حالت کی طرف پھر لوٹا دیتے ہیں۔ تو کیا پھر بھی وہ سمجھتے نہیں۔"(یس:68)
"پھر (رفتہ رفتہ) اس کی حالت کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا۔"(التین:5)
اسی حالت میں چل کر انسان موت سے جا ملتا ہے۔ یہ عام انسانی زندگی کی آخری سیڑھی اور آخری مقام ہے۔ انسان دنیا کی رنگینیوں میں مگن ہوتا ہے۔ مگر اجل کے فرشتے ایام زندگی لپیٹ چکے ہوتے ہیں اور یہ نعرہ مستانہ لگاتے ہوئے آتے ہیں۔
(کل نفس ذائقۃ الموت)
موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ ہر انسان کو اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:
"اس نے موت اور زندگی کو پیدا کی تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے۔"(الملک:2)
ایک دانا کا قول ہے کہ "موت اور تیر سے بڑا واعظ کوئی نہیں۔"
انسان کو مرنے کے بعد پھر زندہ کیا جائے گا وہ پھر جی اٹھے گا اور اپنے افعال و اعمال کا جواب دہ ہو گا۔ قرآن فرماتا ہے:
"کیا انسان گمان کرتا ہے یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔"(القیامۃ)
انسانی زندگی کا سفر مٹی سے لے کر نطفہ پھر نطفہ سے فولادی جسم اور اس کے بعد بڑھاپے کی بادشاہی پھر آخرت کا رخت سفر انسان کے لئے خالق کو جاننے کی ایک عظیم نشانی ہے۔ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو کیا لاتا ہے۔ اور جب چلا جاتا ہے تو کیا لے جاتا ہے۔
اک سفر دو گز کفن کے واسطے

انسان اور نفسیات

ظہور احمد (3rd year)

رب کریم نے اس عظیم کائنات میں انگنت مخلوقات تخلیق فرمائی ہیں اور جن میں سے ایک تخلیق حضرت انسان کی بھی ہے۔ جس کو باری تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا جس کو رب کریم نے خود "احسن تقویم" کے سانچے میں ڈھال کر اپنے خالق ہونے کا راز بتلایا اور اس کے اندر بے پناہ خوبیاں اور صلاحیتیں رکھیں تاکہ یہ خود مختار بندہ اپنے رب کو بخوبی جان سکے مگر افسوس انگنت نعمتوں کے باوجود انسان ناشکری کی رٹ لگائے "لکنود" کا نعرہ بلند کرتا ہے۔

اب ہم ترقی یافتہ دور سے گزر رہے ہیں اس دور میں علوم، فنون، سائنس اور جدید ٹیکنالوجی اپنی معراج پر دکھائی دیتی ہیں اور اسی طرح اگر ہم انسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جب سے انسانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا شروع کیا تھا، اسی وقت سے اب تلک ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش جاری و ساری ہے اور آج ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضرورت پہلے سے بھی کہیں زیادہ اور شدید ہوگئی ہے اور باقاعدہ ایک ایسے علم و فن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہو جو کبھی انسانی کردار کے ذریعہ سے ہو اور کبھی انسانی ذہن کے افعال کے مطالعہ سے انسانی سوچ اور رویوں کے بارے میں بتاسکے، اس جدید دور میں پیچیدہ مسائل اور مصروف مشینی زندگی نے ہمیں ایک دوسرے سے بہت دور کردیا ہے یعنی ہم انسانی معاشرہ میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں، اس بڑھتی ہوئی خلیج اور خلا کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسے علم یا Technique کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو ان مشکلات کو حل کرسکے۔ ماہرین مختلف دور میں مختلف علوم (Techniques) کے ذریعہ انسان کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کوششوں میں سے ایک کوشش جس کو ماہرین نے سراہا وہ علم نفسیات ہے، جو انسان کے تمام ذرائع سے حاصل ہونے والا علم اور ذہن، افکار و کردار اور رویوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ علم نفسیات انسان کو جاننے اور اس کو پرکھنے کا آسان ذریعہ ہے، کیونکہ علم نفسیات انسان کے کردار اعمال اور ذہنی سوچ و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کی مدد سے انسانی نشوونما کے مدارج ،تربیت اور ذہن کے اصول ذہانت کی نشوونما میں آسانی ہوتی ہے۔ ماہرین نے مختلف ادوار میں علم نفسیات کی مختلف تعریفیں کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ یونانی مفکر افلاطون کے نزدیک "علم نفسیات روح کا علم ہے" نیز اس کے علاوہ بھی بے شمار تعریفات بیان کی جاسکتی ہیں جبکہ میرے نزدیک "علم نفسیات انسانی ذہن اور کردار کے مطالعہ کا نام ہے۔"

اس وسیع علم کے دائرہ میں صرف حضرت انسان نہیں بلکہ دیگر

جانداروں کے کردار کا مطالعہ بھی شامل ہے جو کہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

اب علم نفسیات کے پیرائے میں انسانی نفسیات کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں تو عمل خطا انسان کی سرشت میں شامل ہے اور یہ اول انسان ہی کی خطامحبت تھی جس کی وجہ سے اس شجر ممنوعہ کو چکھ لیا تھایعنی محبوب کے منع کردہ کام کو کرلیا اوراس کام کا محرک کوئی بغاوت یانافرمانی نہ تھی بلکہ محبوب کی ابدی رضامندی اور اس کی عطاکردہ بہشت میں دائمی سکونت تھی جس کے ذریعے محبوب کا قرب اور محبت دائمی طور پر ملنے کی طلب اورامکان تھا۔اسی طرح اولاد آدم بھی خطامحبت کی مرتکب ہوتی رہی ہے اور یہ عمل اس کے ساتھ روز اول سے آج تک جاری ہے اور محبت کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔ اُس وقت انسان کی ذہنی کیفیات کیاہوتی ہونگی جب ایک محب اپنے محبوب کی محبت کوبڑھانے کے لیےڈھال بن جاتاہے،جو ایمان کو بچانے کے لیے گرم تیل کے اندر کودنے کے لیے تیار رہتاہے،ایک ماں اپنے معصوم بچے کو تیروں کے سائے میں مرنے کے لیے پیش کرتی ہے یہاں تک کہ مسلمانوں کے روبہ زوال ہونے کے بعد بھی معرکہ میدان میں اولیاء اللہ تیر و تلوار اپنے جسم اطہر پر برداشت کرکے دشمن پر غالب آیاکرتے تھے۔ جب ان سب باتوں کا جوڑ دیکھتے ہیں تو ان باتوں کی اصل فطرتِ انسان اور نفسیات کے تحت ہی روح اور ذہن کا کردار سامنے آتاہے۔ مشہور مقولہ ہے"لوگوں کے ذہنوں کے مطابق ان سے بات کرو" یعنی ان کی نفسیات (حرکات وسکنات) کو جان کران سے کلام کروجب ایک فرد کی نفسیات (ذہنی سوچ وکردار اوررویوں)کا پتہ چلے گا تو اس مجسمہ انسان کو آپ کسی بھی پیرائے میں رکھ کر کوئی بھی کام کرواسکتے ہیں۔

الحاصل: علم نفسیات وہ علم ہے کہ جس کے تحت ایک فرد کابخوبی مطالعہ کرکے اس کو ایک اچھے سانچے میں ڈھال کر نہ صرف انسان کے کردار، (ذوق وشوق، حق وباطل صحیح وغلط اور عدل وانصاف)میں تمیز کرواسکتے ہیں بلکہ ملک کی ترقی و خوشحالی بھی انہی افراد کے مرہون منت ہوگی۔ایک ماہر نفسیات ہمیشہ لوگوں کے افعال اور کردار کابغور مطالعہ کرتاہے اور وہ لوگوں کی خواہشات ومحرکات ورجحانات اور طریقہ فکر وعمل کابغور جائزہ لیتاہے۔

تین دوست تین دشمن

تمہارے تین دوست ہیں:(1)تمہارادوست (2)تمہارے دوست کادوست (3)تمہارے دشمن کادشمن

تمہارے تین دشمن ہیں:(1)تمہارادشمن (2)تمہارے دوست کادشمن (3)تمہارے دشمن کادوست

مراسلہ:۔ ضمیر حسین 2nd year

امت مسلمہ کا عروج وزوال

امیر بخش(3rd year)

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں افضلیت واشرفیت حضرت انسان کو ہی حاصل ہے، اسے من جانب اللہ یہ خطاب عطاء ہوا۔ پھر انسانوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی اُمت کو خاص فضیلت عطاء فرمائی۔ جیسا کہ مفہومِ ارشاد ربانی ہے کہ تم بہترین امُت ہو ، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو۔

تاریخ کے ہر دور میں مسلمان کامیاب و کامران رہے ہیں۔ جسکی وجہ قربانی کے جذبے کا انکے دلوں میں پیوست ہونا اور اسلام کے نام پہ اپنی جان تک قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرنا تھا۔ جیسا کہ صحابی رسول حضرت حنظلہ کا مشہور واقعہ ہے کہ شادی کی پہلی رات آپ نے شب باشی فرمائی اچانک ندا ہوئی کے آؤ جہاد کے لیے اللہ کے رسول بلا رہے ہیں تو اس عاشق رسول کے عشق کا عالم دیکھیں کہ انھیں غسل کرنا تک یاد نہیں رہا اور میدان جہاد میں پہنچ کر جام شہادت نوش فرمایا اور بعد میں آپ کو ملائکہ نے غسل دیا۔ اسی بنا پر آپ کو غسیل الملائکہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات بیان کئے جاسکتے ہیں۔ بہر کیف مسلمانوں کا اسلام اور رسول ﷺ سے کیا تعلق ہے اقبال نے بڑے خوبصورت انداز سے بیان فرمایا ہے کہ

یہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

مسلمانوں نے ہر میدان میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے اور دوسری جانب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں بڑے ہی شفیق اور متحد ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ اور آپ کے رفقاء کی آپس میں محبت و الفت کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے کہ۔ محمد رسول اللہ والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعا سجدا یبتغون فضلا من الله و رضوانا(الفتح ۲۹) یعنی کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحمدل ہیں، تم ان کو رکوع اور سجدوں میں دیکھو گے وہ اللہ کا فضل اور اسکی رضامندی کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ کہنے کو تو کوئی کچھ بھی کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی تمام عزتوں اور عروج کا سبب یہی اوصاف و کمالات تھے۔ آیئے امت مسلمہ کے اوصاف و کمالات (جو ان کی ترقی اور عظمت کا باعث بنے) کی چند جھلکیاں دیکھیں تاکہ واضح ہو کہ اس نظریے نے انھیں کیا سے کیا بنا دیا۔ ان اوصاف کی ابتدا اسی آیت کریمہ سے کرتے ہیں پھر چند دیگر اوصاف کا بھی تذکرہ کیا جائے گا۔

باطل سے سمجھوتہ نہ کرنے والے: ان کے تمام رشتوں اور تعلقات کی بنیاد ایمان اور صرف ایمان تھا وہ باطل سے کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ یہ چیز ناقابل تصور تھی کے وہ کسی بھی ذاتی مفاد اور باہمی اختلاف کی بنا پر باطل سے معاہدہ کریں ان کے باہمی حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں وہ ہر طور باطل کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کا ایمان ان کی ذاتیات پر بہت مقدم تھا؛ قران کریم نے ان کی اسی صفت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا(اشد آء علی الکفار)وہ کفار پر بڑے شدید ہیں، اس اشداء سے کیا مراد ہے۔مایہ ناز مفسر جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری اس پس منظر میں فرماتے ہیں کہ۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کی توصیف فرمارہاہے، کہ میرے رسول مکرم پر ایمان لانے والے اور اس کی صحبت سے فیض یاب ہونے والے کفار کے مقابلے میں بڑے بہادر بڑے طاقتور ہیں یہ سر کٹا سکتے ہیں لیکن ظلم کے سامنے اسے جھکا نہیں سکتے۔ یہ بکاؤ مال نہیں کہ دشمنان اسلام انکو خرید لیں ،یہ بزدل اور ڈرپوک نہیں کہ جور و ستم سے ان کو راہ محبت سے برگشتہ کیا جائے۔ غزوہ بدر میں جو ہوا کہ باپ بیٹے کے مقابلے میں بھائی بھائی کے مقابلے میں اور بھانجاماموں کے مقابلے میں صف آراء تھا،جو کہ اس آیت کی ایک عملی تفسیر ہے۔غزوہ بدر کے بعد ایک دن جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے انکے بیٹے نے کہا کہ اباجان بدر میں ایک موقع پر آپ میری تلوار کی زد میں تھے میں نے صرف اس لیے آپ پر وار نہیں کیا کہ آپ میرے والد تھے۔ تو آپ نے فرمایا بیٹا! تونے تو باپ ہونے کا لحاظ کر لیا۔لیکن اگر تو میری تلوار کی زد میں آتا تو میں کبھی نہ سوچتا کہ میرا بیٹاہے میں یہی سوچتا کہ اسلام کا دشمن ہے اور تیرا سر اڑادیتا۔صحابہ کرام آپس میں ٹوٹ کر محبت کرنے والے ،عبادت میں مگن رہنے والے ،اپنے نفس کا محاسبہ کرنے والے ،خدا اور رسولؐ کے فرمانبردار ، امانتوں کے پیکر ، اپنے امیر کے اطاعت کرنے والے، بیباک اور حق گو تھے۔ علامہ ڈاکٹر اقبال کے نزدیک امت کے اسباب وزوال یہ ہیں۔

اگرچہ زر ہے جہاں میں قاضی الحاجات
جو فقرے ہے سیر تونگری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے جس کو تو خود سمجھتا ہے
زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں میرا جوہر آشکاراہوا
قلندری سے ہوا ہے سکندری سے نہیں

ایمان سے رسمی تعلق: اگرچہ ہم مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں،نماز بھی پڑتے ہیں صوم وصلاۃ کے بھی پابند ہیں مگر پھر بھی ہم روزبروز زوال کی طرف کیوں جارہے ہیں ہمارا تعلق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ قوی نہیں ہے۔اور اسباب زوال امت میں سے ایک بڑا سبب فرقہ بندی ہے۔آج ہم مسلمان اسلام کے بجائے دیگر مذہبی اختلافات اور فرقہ

پرستی میں گم ہو چکے ہیں۔ ہم نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ حضور سے ہمیں صرف زبانی دعوی عشق و محبت ہے مگر عملی طور پر ہم آپ ﷺ کی سنتوں اور سیرت مبارکہ پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ اقبال نے کیا خوب فرمایا۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہو کر
تم خوار ہوے تارک قران ہو کر

صحابہ کرام بھی مسلمان تھے جن کی عظمتیں آج تک زندہ و تابندہ ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آج ہماری نوجوان نسل جو دولت کے نشے میں بدمست پھرتی ہوئی نظر آرہی ہے ان کو اس نشے سے کیسے نکالا جاسکتا ہے؟ اور یہ مسلمان جو زوال کی طرف سفر جاری رکھے ہوے ہیں ان کو دوبارہ کامیاب وکامران بنانے کے لئے ایک ہی طریقہ ہے۔ ان نوجوان مسلمانوں کے دلوں میں جو غیر کی محبت بس چکی ہے جس کی وجہ سے یہ نفس پرستی کے نشے میں گم ہو چکے ہیں۔ ان تمام نشوں کو ختم کرنے کے لئے اس کے مقابلے میں عشق مصطفی ﷺ کو پروان چڑھانا ہو گا تب ہی جا کر دوبارہ یہی امت مسلمہ شاہراہ عروج پر گامزن ہو سکتی ہے۔

رسالہ راہ علم و عمل کا پیغام آپ کے نام

اگر آپ کسی بھی شعبے کے طالب علم ہیں اور کچھ بھی لکھنا چاہتے ہیں تو ضرور لکھیں اور ایک چھوٹا سا مضمون لکھ کر ہمیں ارسال کریں۔ ہم اسے شائع کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

اگر آپ کتب فروش ہیں تو ہمارے اس رسالے کو پورے پاکستان میں پہنچانے کے لئے ہمارے دست و بازو بنیں تا کہ اس رسالے کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جاسکے۔

اگر آپ اپنے کاروبار کا اشتہار دینا چاہیں تو ہمیں دیں تا کہ ایک تو آپ کے کام کی پبلسٹی ہو اور دوسری طرف اس کام میں ہماری معاونت ہو، تا کہ اس ششماہی شمارے کو سہ ماہی اور پھر ماہانہ بنیادوں پر شائع کیا جاسکے۔ شکریہ

مزید معلومات اور رابطے کیلئے

www.facebook.com/Rah e ilm o amal 0336.3164310

Issues of Pakistan's Economy and their Solutions

By

S.M.Zubair Sherazi (5th year)

Seventy years have been passed since the establishment of Pakistan. This duration can play a significant role in advancing any country's economy.

In spite of that Pakistan has, so far, implemented several Five-year plans, but the desired objective of economic development is still far away. The economy is creeping at a tortoise pace even with the help of foreign-aid crutches, the country despite being an agrarian by its very nature, could not attain self-sufficiency till now even in food–grain. Foreign debts have accumulated to such an extent that it has begun to sallow more than one –third of annual budget and one-fourth of foreign exchange earning per annum. Such an alarming state of economic affair is a result of a number of obstacles. Some, very critical of them, may be divided into following four broad categories.

1) ECONOMIC OBSTACLES

Economic obstacles are of the following nature.

i. **Viciousness of the vicious circle of poverty**: Pakistan being an underdeveloped and deficient resourced country has been badly trapped in vicious circle of poverty. This circle is caused by the consequences of the backwardness of economic forces like low productivity, market imperfections, deficiency of capital, small size of local market, low inducement to investment and low capacity of saving etc.

ii. **Under-utilization of available natural resources:** Under-utilization of available natural resources like land, water, minerals and power etc. is another main obstacle to economic development. Pakistan is quite rich in these natural resources. Its land is fertile, water is plentiful, climate is suitable, but these resources are not being fully exploited due to the lack of developed human resources.

iii. **Rapidly growing population**: The population of Pakistan is growing at almost 2.6% per annum, which is the highest rate of growth in the world. As a result, the proportion of dependable population below the 15 years and above the age of 65 has gone up to almost 55% , which is adding an unbearable

burden on the economy , having weak foundations, What has , so far, been achieved through development efforts has simply absorbed by rapidly growing non-functional population.

iv. **Low level of technology diffusion constraint:** Low level of technology diffusion is also impeding the growth of the various sectors of the economy. It so because the country is confronting a number of problems like lacking required technical know-how, exists of surplus unskilled labour, low rate of human capital formation, deficient institutions and low standard of technical education and training.

v. **Agricultural dependency constraint:** Nearly 60% of the total population is depending, for her livelihood, directly or indirectly, on agriculture sector which itself is in developing stage, Its contribution to GNP is decreasing instead of increasing, Highly inequitable distribution of land resources, faulty tenure system, soaring effects of waterlogging and salinity and limited use of latest agricultural technology are the critical hurdles affecting the performance of this key sector which , in turn, affects the efficiency of all the other sectors and sub-sectors of the economy.

vi. **Huge magnitude of indebtedness:** As on Jan 2016 total debt liability stood at Rs 68.550 billion , which constituted almost 180% of GDP 36% of export earnings, 23% of foreign exchange earnings, 83.3% of tax revenue, 63% of total revenue, 45.5% of total expenditure and 52.6% of current expenditure. Such a huge magnitude of indebtedness is coming in the way of efforts to finance economic development projects in a number of ways.

vii. **Huge non-development expenditure**: The order of non-development expenditure; made on defence and debt servicing, is very high. More than 70% of the current revenue is spent on these two heads.

viii. **Low level of foreign exchange earnings:** Pakistan being basically a foreign trade-oriented country, has to rely upon the export of a few items like cotton, rice, carpets, sports, surgical instruments and hides and skins etc. The excessive reliance on few primary type exports has made the economy unstable. Besides, unfavorable terms of trade, restrictions of quota system and the restriction to follow a liberal trade policy have further decreased the foreign

exchange earnings.

ix. **Persistent devaluation and depreciation of rupee:** So far, Pakistan's Rupee has lost its external value nearly to 450% over the years, Persistent devaluation and depreciation are also serving as big hurdle in the process of economic development. The efforts which have been so far made to increase the level of foreign exchange earnings have simply vanished with the devaluation and depreciation of Rupee.

2) SOCIAL AND CULTURAL OBSTACLE

Pakistan's current social and cultural setup is also serving as a deterrent factor to her economic development. More than70% of the population is illiterate. In remaining 30% such people are also included who can just read and write their names. Consequently the majority of the people due to their mass illiteracy are mostly ignorant to the development taking place within the country not to speak of around the world.

The society as a whole may be labeled as a consumption-oriented or a highly extravagant society unnecessary expenditure on different occasions like marriages, deaths, births and other ceremonies merely showing the class pride, are lavishly made. Therefore, the propensity to save and to invest is among the lowest in the world. Furthermore, most of the people are conservative in their habits and approach of minds. They are, therefore, not easily receptive to new technology and latest scientific methodology of production. The caste system is also operating frequently in terms of occupational activities, though mostly are urban-centered, yet they come in the way of economic development process in a number of ways. Majority of the people are religious-minded and a number of sects are activated with full fervor of sectarianism. The country has to suffer all the negative approach.

Thus the rate of functional or economically activated population is among the lowest in the world.

3) POLITICAL OBSTACLES.

So far, the political factor has been playing a regrettable role in the economic development of the country since it came into being. The political uncertainty, the instability of the government and the inconsistency of economic policies had been the key factors, which played their worst negative role. There had been frequently occurring rapid change not only in the successive governments but also in economic policies, strategies and priorities. Each government, which took over the

power, had been badly following the policy of condemnation of whatsoever was done by the predecessor government. It had been a frequent practice of each new government to formulate its own plans, chalk out its own course of action, setup its own priorities and select its own strategies at the heavy cost of giving up the on-going uncompleted projects. The country, thus had to suffer an irremediable cost of economic development so far has been made.

Ironically, the country could not be benefitted through the selfless services of the true, honest, and loyal statesmen; with exception of few early founders. Most of the politicians had been considering the politics a highly profitable business. Their activities had been mainly focused to grind their own axes; to plunder the national wealth by hook or by crook. The credit goes to those politicians who inducted the deplorable phrase of horse-trading in the history of Political Science.

4) ADMINISTRATIVE OBSTACLES.

There is no need to mention these obstacles because everyone is well aware of it e.g. according to recently NAB's submitted report to ATC only Dr Asim has allegedly involved in Rs 450 billion (4, 50, 000000000) corruption.

Solutions

- Development of agriculture sector on preferential bases.
- Reactivating Industrial Sector.
- Facilitating means of transportation in a true sense.
- Employing experts rather than inexperienced and illiterate men.
- Equal Distribution of wealth.
- Providing technical Education.
- The Economy should be industrial rather than agrarian nature.
- The case of extortion should be dealt with irony hands.
- Corrupt politicians should be sentence to death.
- Interest free loans should be granted to start small businesses without any documental hurdles.
- **Islamic Economic system is the sole solution to all these above mentioned problem.**